انتخاب

مضامینِ سرسیّد

یعنے

آنریبل جناب ڈاکٹر سر سیّد احمد صاحب مرحوم کے۔ سی۔ ایس
آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے چیدہ چیدہ
مضامین کا لاجواب مجموعہ

برائے

اُمیدواران امتحان ایف اے پنجاب یونیورسٹی و دیگر شائقین

بفرمائش

ایم۔ فرمان علی بُک سیلر لاہور

قیمت ۱۲ر

فہرست مضامین کتاب انتخاب مضامین سرسید برائے ایف۔ اے کلاس پنجاب یونیورسٹی

دیباچہ

حالاتِ مصنّف

سر سید احمد سید محمد متقی کا بیٹا تھا۔ ذی الحجہ سنہ ۱۲۳۲ھ دہلی میں پیدا ہوا اس کے بزرگ عرب سے ہرات میں آئے تھے۔ اور شاہنشاہ اکبر کے زمانے میں اس جگہ سے ہندوستان آئے۔ اس کے دادا نے شاہنشاہ ہند عالمگیر اورنگ زیب کے زمانہ میں (سنہ ۱۰۲۴ھ سے سنہ ۱۱۱۸ھ) تک جواد الدولہ کا خطاب حاصل کیا۔ اور اس کا نانا خواجہ فرید الدین احمد ہندوستان میں بھاری عہدہ پر ممتاز تھا۔ اور لارڈ ولزلی کی طرف سے بطور سفیر ایران بھیجا گیا تھا۔ اور مدبر الدولہ۔ امین الملک۔ خان بہادر کے خطابات رکھتا تھا۔

سر سید احمد کی عمر ابھی انیس سال کی تھی۔ کہ ان کے والد بزرگوار اس جہان سے کوچ کر گئے۔ ایک سال بعد انہوں نے ہندوستانی عدالت میں بطور محرر کے ملازمت اختیار کی لیکن جلدی ہی فتح پور سیکری علاقہ آگرہ میں بطور سب جج مقرر کئے گئے۔ چند سال کے بعد دہلی کی چند خاص قدیم یادگار دل

کے بارے میں کتاب بنام (آثار الصنادید) تالیف کی۔ اس کی وجہ سے ان کی علمی اور ادبی لیاقت مشہور ہو گئی۔ اس لئے ہندوستانی سلطنت کی ایشیاٹک سوسائٹی نے انہیں اپنا ممبر منتخب کرلیا۔ غدر کے زمانہ ۱۸۵۷ء میں یہ بجنور کے سب جج تھے۔ اور مذکور غدر کے طرفدار نہ تھے۔ کیونکہ ان کو اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ ہندوستانی ابھی تک حکومت کے اہل نہیں ہیں۔ غدر بجائے فائدہ کے سخت نقصان دہ ہوگا۔ اُنہوں نے غدر کے لیڈروں کو نصیحت کی۔ لیکن وہ ان کو برا کہتے تھے۔ اُنہوں نے بہت سی یورپین عورتوں اور مردوں کو صحیح سلامت میرٹھ پہنچا دیا۔ غدر کے خاتمہ پر گورنمنٹ انگلیشیہ نے مبلغ ۲۰۰ روپے دائمی پنشن اس کے خاندان کے لئے مقرر کی۔ اور ستارہ ہند کا خطاب دیا۔

باوجود ان تمغہ جات اور خطابات کے اُنہوں نے اپنے وطن کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کی۔ ان کا خیال تھا۔ کہ جب تک ہندوستانی علم سے مسلح اور تعلیم و تربیت میں پورے کامل نہ ہو جاویں۔ ان کو آزادی اُن کے لئے سود مند نہ ہوگی۔ ان پر واضح ہوگیا۔ کہ ہندوستانیوں کے پیچھے رہنے کا سب سے بڑا سبب جہالت کا غلبہ ہے۔ اور دوسری وجہ اندھا دھند تعصب ہے۔ اور اس کی وجہ سے مغربی علوم یعنی سائنس اور فلسفہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور اس وجہ سے آباؤ اجداد کے وقار و عزت کو لئے بیٹھے ہیں۔ سر سید صاحب نے باون برس کی عمر میں خود انگلستان کا سفر کیا۔ اور اپنے بیٹے سید محمود کو شہر کیمبرج میں مغربی تعلیم حاصل کرنے

کے لئے بھیجا۔ اس نے خود تمام تعلیمی مرکزوں کا بغور معائنہ کیا۔ اور مغربی تعلیم سے متاثر ہو کر خود ایک بڑی درسگاہ قائم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا

سر سید احمد نے یورپ جانے سے پیشتر ایک انجمن ترجمہ بنائی تھی اور اس کی خدمت سے تمام علوم مغربی کو ہندوستانی میں ترجمہ کر کے ہندوستانیوں کو مستفید کیا جاتا تھا۔ انگریزی حکومت نے بھی اس انجمن کو مدد دی۔ اور اس خدمت کے سلسلے میں اس کے بانی مبانی کو ایک سونے کا تمغہ دیا۔

سر سید احمد ہندوستانی اصلاح کا بہت بڑا محرک اور مسلمانوں کی ترقی کا باعث ہے۔ علی گڑھ کالج کو قائم کرنے کی خاطر اس نے اس قدر مصائب کا سامنا کیا۔ کہ احاطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ عام مسلمان لوگ انگریزی تعلیم یافتہ کو خارج از اسلام سمجھتے تھے۔ اور علماء بھی سر سید صاحب پر کفر کا فتوے دینے لگے۔ لیکن وہ پاک ہستی اپنی جدوجہد میں سرگرم رہی۔ خود چندہ جمع کیا۔ کالج کی منظوری حاصل کی اور اس کی بنیاد ۱۲۹۴ھ میں لارڈ ولٹن نے رکھی۔ آج اس کی سرگرم کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر ایک صوبہ میں چند اشخاص ایسے ہونگے۔ جو علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ یہاں دیسی پروفیسروں کے علاوہ آٹھ انگریز پروفیسر بھی اعلے پیمانہ پر تعلیم دیتے ہیں۔ کالج میں انگریزی۔ سنسکرت۔ عربی۔ فارسی۔ جغرافیہ ریاضی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

سر سید احمد خاں وطن پرست تعلیم کا زبردست حامی تھا۔ اس کے

علاوہ بذاتِ خود عالم اور جرنلسٹ تھا۔ اس کی تقریریں اور تحریریں بہت مشہور ہو چکی تھیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعہ۔ جو اخبار ریفارمیشن میں اشاعت کیا کرتا تھا۔ لوگوں کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرایا۔ کہ انگریزی تعلیم انسان کو کافر نہیں بناتی۔ اس کی متعدد تصنیفات میں سے پہلی کتاب آثار الصنادید ہے۔ جس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہو گیا ہے۔ دوسری کتاب ہندوستان کی غدر کی بابت ہے۔ اس کا ترجمہ بھی انگریزی زبان میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے توریت کی تفسیر بھی کی ہے۔ جو تین جلد پر مشتمل ہے۔ قرآن کی حدیث بھی مرتب کی ہے۔ بے شمار تقریریں اور رسالے مذہبی۔ سوشل تعلیمی مضامین پہ لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک رسالہ جناب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے بارے میں ہے۔

سر سید احمد مشرقی دنیا کے قابل شہرت اور مشہور ہستیوں میں سے ایک ہے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے۔ اس کی مشہوری اور بزرگی کا آوازہ اس کے ہم وطنوں کے سامنے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ سر سید احمد ملکی اصلاح کا بانی مبانی اور ہندوستان کا محسن ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں میں بزرگ ترین ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتخابِ مضامینِ سرسیّد

۱۔ تعلیم

تعلیم سے ہماری مُراد موافق عرفِ عام کے لکھنا پڑھنا سیکھنے سے ہے۔ ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں آدمی مختلف مقاصد سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہے ہیں۔

عام مقصد جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے۔ خواہ تعلیم پانے والے خود اس پر متوجہ ہوں۔ یا اطفال کے مربّیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو یہ ہے۔ کہ اُن کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہوتی ہے۔ کہ ایک جاہل کندۂ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوئی ہو۔ زندگی کے کاروبار میں اس کے لئے نہائت مفید اور کار آمد ہوتی ہے۔ ان تعلیم پانے والوں میں لاکھوں آدمی تو ایسے ہوتے ہیں۔ کہ ادنےٰ درجۂ تعلیم تک پہنچکر اور کچھ متوسط درجہ کی تعلیم تک پہنچکر رہ جاتے ہیں۔ اور چند ایسے ہوتے ہیں۔ کہ متوسط درجہ کی تعلیم سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور اپنے مذاق کے موافق علم کی شاخوں میں سے کسی

شاخ کی تکمیل پر مائل ہوتے ہیں۔ کوئی شاعر بننا چاہتا ہے۔ کوئی ادیب کوئی فلسفہ میں ترقی کرتا ہے۔ اور کوئی ریاضیات میں۔ اور کوئی دینیات میں وعلیٰ ہذا القیاس۔ مگر ہر ایک کے ساتھ حصول معاش کا خیال لگا رہتا ہے اور جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے۔ یا کرنا چاہتا ہے۔ اس کو ذریعہ حصول معاش ضرور سمجھتا ہے*

تعلیم بغیر اس کے کہ اسکے حاصل کرنے کے لئے کوئی زبان اختیار کی جاوے۔ غیر ممکن ہے۔ جس زمانہ میں جس زبان کا عروج ہوتا ہے۔ وہی زبان اس کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ یہ ایک کلیہ قاعدہ ہے۔ کہ جس ملک میں جو زبان حکومت کرتی ہے۔ اسی زبان کا عروج ہوتا ہے خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ میں عربی زبان کا عروج تھا۔ ہر شخص اسی زبان میں علوم کو سیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانہ میں ہندوستان میں سنسکرت زبان کا عروج تھا۔ اسی کو لوگ اختیار کرتے۔ تھے۔ جب مسلمانوں کی عملداری ہندوستان میں ہوئی تو فارسی زبان کا عروج ہوا اور سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا۔ اب ہندوستان میں انگریزی حکومت ہے۔ جس کی زبان انگریزی ہے۔ اور اسی زبان کو عروج ہے۔ اس لئے ہر شخص اسی زبان کے اختیار کرنے پر مائل ہے۔ ہاں مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں بہت کچھ کوتاہی کی۔ اس کے کچھ ہی سبب ہوں۔ مگر اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا۔ کہ وہ اپنی غلطی سے انگریزی زبان پڑھنے کو مخالف

مذہب اسلام سمجھتے تھے۔ مگر جب سے یہ خیال کم ہو گیا۔ یا دنیوی ضرورت نے انہیں مجبور کیا۔ اسی وقت سے مسلمانوں نے انگریزی زبان میں تعلیم اختیار کرنا شروع کر دی ہے۔ مگر بہت سے مسلمان مذہب کو دنیوی ضرورت سے مقدم سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان میں یہ خیال کہ انگریزی پڑھنی مذہب اسلام کے برخلاف ہے کم ہو گیا ہے۔

اکثر حکام اور نیز بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ لوگ صرف سرکاری نوکری حاصل کرنے کیلئے انگریزی پڑھتے ہیں۔ مگر غور کرنے کی بات ہے۔ کہ ہر سال ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے سینکڑوں بی۔اے اور ایم۔اے۔ کی ڈگری پاتے ہیں۔ اور ان کو یقین کامل ہوتا ہے۔ کہ گورنمنٹ کے پاس اس قدر نوکریاں نہیں ہیں۔ کہ وہ اس جم غفیر بی۔اے اور ایم۔اے ڈگری یافتوں کو دے سکے۔ پس یقینی ڈگری یافتہ طالب علموں کو اس کا یقین ہے۔ کہ سب کو سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ باوصف اس یقین کے جو وہ انگریزی پڑھنے پر مشغول ہیں۔ تو ضرور ہے۔ کہ سوائے ملازمت سرکاری کے اور کسی ذریعہ سے بھی ان کو معاش حاصل کرنے کا خیال ہے۔ یا اس بات کا یقین ہے۔ کہ انگریزی پڑھا ہوا بہ انگریزی پڑھے ہوئے سے دنیوی کاروبار کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔ بہرحال یہ بات غلط ہے۔ کہ ہر ایک بی۔اے اور ایم۔اے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے پڑھتا ہے۔ اور نہ ملنے کے سبب سرکار سے

ناراض ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کو پہلے سے یقین ہے۔ کہ سرکار سب کو نوکری نہیں دے سکتی۔ ہاں جب موقع ہوتا ہے۔ تو ہر ایک سرکاری ملازمت ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو اس کو ضرور کرنی چاہیئے۔

اس زمانہ کی تعلیم میں جو بذریعہ انگریزی زبان کے ہوتی ہے اور اگلے زمانہ کی تعلیم میں جو بذریعہ عربی زبان کے ہوتی تھی۔ یہ فرق ہے کہ اگلے زمانہ میں تعلیم کا سامان ایسا موجود اور مہیا تھا۔ کہ ہر شخص جو علم کی کسی شاخ میں یا شاخوں میں اس زمانہ کے موافق اعلےٰ درجہ کی تعلیم پانا اور اس فن کا ماسٹر ہونا چاہے۔ تو ہو سکتا تھا۔ اور سوسائٹی جو اس زمانے میں موجود تھی۔ اس تعلیم کی مدد کرتی تھی۔ اور اس پر عمدہ اخلاقی اثر ڈال کر اس کو اس سوسائٹی کے لائق کر لیتی تھی۔ اگلے زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق و حسن معاشرت کے ایسی عمدہ تھی کہ اس میں کوئی نقص اس زمانہ میں بھی نہیں نکالا جا سکتا۔ مگر افسوس ہے۔ کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ وہ قائم نہ رہی۔

اس زمانہ کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی کسی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہیئے۔ تو اعلےٰ درجہ کی تعلیم پا کر اس فن کا ماسٹر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی وہ یونیورسٹیاں ہیں۔ جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ وہ بلاشبہ بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اس تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک

محض ناواجب ہے۔ بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے۔ اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔

بالفعل جو باتباع احکام یونیورسٹیوں کے اس کے ماتحت کالجوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ زیادہ تر کتابی اور دماغی تعلیم سے متعلق ہے۔ اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ ضروری ہونا چاہیئے۔ جو مسٹر کرول نے اپنے لیکچر میں بیان کیا ہے۔ اور جس کو اودھ اخبار نے اردو زبان میں لکھا ہے۔ اُنہوں نے فرمایا۔ کہ تعلیم کا منشا یہ نہیں ہے۔ کہ چند آدمیوں کی دولت بڑھ جائے یا آنکہ غربا کے مقابلہ میں باقیماندہ اشخاص کی زیادہ رعائت کی جائے۔ اور نہ تعلیم کا منشا یہ ہے۔ کہ اس کے ذریعہ سے لوگ صرف اپنی باہمی محافظت کریں۔ یا سوداگری اور تجارت ہی کو ترقی دیں بلکہ تعلیم کی خاص غایت اور اصل منشا یہ ہے۔ کہ لوگ نیک محضر اور عمدہ قسم کے باشندے ہو جاویں۔ اور خاموشی حاصل کریں۔ جو زندگی کے لیے داغ رہنے سے حاصل ہو سکتی ہے اور لوگوں کے سوشل اور اخلاقی خصائل کی تکمیل کرلیں۔ اور ان بھاری اور عمدہ کاموں کا حوصلہ دلائیں۔ جن سے ملک کی عزت اور زینت ہوتی ہے۔

سرولیم میکورنھ ینگ نے جو ڈگری یافتہ طالب علموں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ اس کا حاصل بھی وہی ہے جو مسٹر کرول نے اپنے لیکچر میں کہا تھا۔ سرولیم میکورتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالب علموں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ کہ ان کی ڈگریاں اس بات کے لئے ہیں۔ کہ وہ اپنے یومیہ

معاملات اور گفتگو میں معزز برتاؤ اختیار کریں۔ اخلاق اور عمدہ تعلیم کی ترقی میں مدد دیں۔ سوشیل نظام اور اپنے ہمجنسوں کی بہبودی کے قائم رکھنے میں کوشاں رہیں۔ المختصر ایک بھاری سلطنت کے برآوردہ شہریوں کے فرائض ادا کرتے رہیں۔

مگر ہماری رائے میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے۔ ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی علماء اور نیک خدا پرست۔ رحمدل۔ نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی۔ وہ مدت ہوئی۔ کہ مردہ ہوگئی ہے اور نئی سوسائٹی جو زمانہ حال کے موافق ہو۔ اب تک قائم نہیں ہوئی۔ یا مکمل نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ نتائج جن کا ذکر مسٹر کردل نے اپنے لیکچر میں کیا۔ یا سر ولیم میکو رتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالبعلموں سے خواہش کی حاصل نہیں ہوتی۔

ہم اس بات کو جیسا کہ اودھ اخبار نے لکھا ہے۔ نہایت مفید اور ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ اسکول ماسٹروں کو چاہئیے۔ کہ اپنے شاگردوں کے نقش ذہن کرتے رہیں۔ کہ وہ اعلےٰ درجہ کا چلن اور شریفانہ اولوالعزمیاں اختیار کریں۔ اور اسی طرح ہمارے کالجوں کے پروفیسروں کو بھی منجملہ ایسے لوگوں کے ہونا چاہیئے۔ جن میں خیالات عالیہ پائے جاتے ہوں۔"
مگر ہماری رائے میں جبتک کہ خود اسی قوم کے چند لوگ اس قوم کی سوسائٹی کے مہذب کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ اور دلی سچی کوشش نہ کریں سوسائٹی کی حالت درست نہیں ہوسکتی۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ باوجودیکہ کئی

قرن گورنمنٹ کو ہندوستانیوں کو تعلیم دیتے ہوئے گزرے۔ مگر انکی سوسائٹی کی حالت ابتک درست نہیں ہوئی۔

نہایت مشکل یہ ہے۔ کہ دنیا میں کسی قوم کی سوسائٹی اور سوشیل حالت ایسی نہیں ہے۔ کہ جس میں ایسے امور بھی شامل نہ ہوں۔ جن کی بنا غلط یا صحیح طور پر مذہبی امور پر مبنی ہوئی نہ کہی جاتی ہو۔ پس اگر وہ امور ترقی سوسائٹی کے مانع ہیں۔ اور غلطی سے ان کی بنا مذہبی امور پر کہی جاتی ہے۔ تو جبتک اسی قوم کا کوئی شخص اس غلطی کو ظاہر نہ کرے۔ اور اس مانع کے رفع کرنے میں کوشش نہ کرے۔ تو وہ رفع نہیں ہوسکتی۔ غیر قوم کے شخص کا اس امر مانع پر متنبہ کرنا گو وہ کیسا ہی سچ کہتا ہو۔ مخالف اثر پیدا کرتا ہے۔ اور خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ شخص بسبب اختلاف قومی یا مخالفت مذہب کے ایسا کہتا ہے۔ اگرچہ ہمقوم اور ہم مذہب والے پر بھی ہزاروں شخص طرح طرح کے اتہام لگاتے ہیں۔ اور اس بات کی سماعت نہ ہونے پر کوشش کرتے ہیں۔ اور گورنمنٹ تو ایسی کوئی بات جس سے مذہب میں مداخلت کرنے کا شبہ بھی ہو۔ اختیار نہیں کرسکتی۔ غرضیکہ اخلاقی اور شریف النفسی کی تعلیم عمدہ سوسائٹی پر منحصر ہے۔ اور انگریزی گورنمنٹ سوائے تعلیم دینے کے اور کوئی طریقہ اختیار نہیں کرسکتی۔ جس سے ہندوستانیوں میں سوسائٹی کی حالت اچھی ہو۔ اور عمدہ سوسائٹی ان کی بن جاوے۔

زنانی تعلیم جس کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا۔ کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ انسان کو انسان اور اس کی عقلی اور دماغی قوتوں کے کامل اور اس کے

اخلاق کو عمدہ بنانے میں بہت کچھ مدد کرتی ہے۔ مگر جب مسئلہ حصول معاش پر نظر کی جاتی ہے تو لوگ کہتے ہیں۔ کہ یقینی امر ہے کہ محض علمی پیشوں میں حصول معاش کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں ہے اور اس لئے ان کا اور نیز ہمارے حکام کا اس طرف خیال جاتا ہے۔ کہ حرفت اور فن کی تعلیم جسے سائنس اور ٹیکنیکل ایجوکیشن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ زیادہ وسعت دی جائے۔ ٹیکنیکل[1] ایجوکیشن کے معنی تو ہم آج تک نہیں سمجھے۔ کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس کی مراد حرفوں کی تعلیم سے ہے۔ جیسے لوہاری۔ نجاری۔ بافندگی وغیرہ وغیرہ۔ تو اس کی ضرورت تو ہم ہندوستانیوں میں بہت کم پاتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہندوستان میں نہیں ہے۔ اگر یورپ کو اور کسی ملک کو اس بات میں کچھ تفوق ہے۔ تو وہ صرف اس وجہ سے ہے۔ کہ جو کام ہندوستان میں ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ وہ ان ملکوں میں کلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مگر کلیں قائم کرنے والے وہ لوگ نہیں ہیں جو ان میں کام کرتے ہیں۔ بلکہ کلوں کے قائم کرنے والی ایک جدا جماعت ہے۔ ہندوستان میں اگرچہ کہیں کہیں ایسی جماعتیں قائم ہوئی ہیں۔ مگر ہندوستان میں عام طور پر ایسی جماعتوں کا قائم ہونا ظاہراً بہت دور اور بعض وجوہ سے اگر نا ممکن نہیں۔ تو مشکل تو ضرور معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] اس انگریزی لفظ کا ترجمہ اُردو میں دستکاری۔ صنعت و حرفت کی تعلیم ہو سکتا ہے۔ مثلاً نجاری۔ آہنگری۔ بافندگی۔ رنگ سازی۔ صابون گری۔ موٹر کا کام۔ شیشے کا کام۔ دیاسلائی بنانا۔ یہ اور ایسے سبھی کام ٹیکنیکل تعلیم کے تحت میں آئیں گے۔

سائنس بلاشبہ نہایت عمدہ چیز ہے اور سائنس کے جاننے والا آج کل کے زمانہ میں قریب قریب ہر حرفت پر پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اور معاش حاصل کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ اس کے پاس ہوتا ہے جیسا کہ یورپ کے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ مگر یورپ کے ملکوں کا قیاس ہندوستان پر نہیں ہو سکتا۔ یورپ میں ہر قسم کے متعدد کارخانے موجود ہیں۔ اور اس لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں سائنس کی تعلیم دینا فائدہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ ہر قسم کے سائنس جاننے والے کے لئے ہر قسم کے کارخانے موجود ہیں۔ جن میں وہ جا سکتا ہے۔ اور اپنی معاش پیدا کر سکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں اس قسم کے کارخانے نہیں ہیں۔ اور نہ ابھی ان کے ہونے کی توقع ہے پس سائنس جاننے والا بجز اس کے کہ سائنس کا عالم ہو کر اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔ اور کوئی ذریعہ معاش کا حاصل نہیں کر سکتا۔ گورنمنٹ ڈاکٹری انجینیری نقشہ نویسی وغیرہ کی جو ٹیکنیکل ایجوکیشن یا سائنس میں داخل ہیں۔ بقدر ضرورت اس ملک کے تعلیم دیتی ہے اور اس ذریعہ سے وہ لوگ معاش بھی پیدا کرتے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ تعلیم کی نہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں گنجائش ہے۔ اور نہ وہ اس تعلیم سے کچھ معاش پیدا کر سکتے ہیں۔

بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی اور اخلاقی اور سوشیل حالت کی درستی کی ہے۔ جو ابھی تک نہیں ہوئی۔ یا پورے طور پر نہیں ہوئی۔ اس کے بعد باقی امور لحاظ کے قابل ہیں۔ پس ہم کو مناسب نہیں ہے۔ کہ ہم دفعتہً سب امور کا ہونا چاہیں۔ بلکہ جو کام ہم کو پہلے

ے علوم حکمیہ۔

کرتا ہے۔ اس کو مقدم سمجھیں اور اس کے بعد جو کام کرنے ہیں کریں۔

۲۔ تعصّب

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے۔ کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اسکی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات جتاتا ہے۔ کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے ہے۔ اس میں نہیں متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے۔ تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے۔ بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے۔ تو اس کے فائدے اور اسکی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے۔ مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا۔ اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے ؂

مذہبی تعصبات کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے۔ مگر اوّل امور تمدن و معاشرت میں جو نقصان تعصب سے پیدا ہوتے ہیں اُنکا ذکر کرتے ہیں

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی جو دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں۔ ضرورت ہوتی ہے۔ مگر متعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے۔ اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز ان چند لوگوں کے جو اس کے ہم رائے ہیں۔ مائل نہیں ہوتا۔

عقل اور قواعد قدرت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ منفعت اور زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور عزت کی ہیں۔ ان کو انسان اختیار کرے۔ مگر متعصب ان سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں۔ کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیئے۔ مگر تعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

وہ ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں۔ محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے۔ اور جو کچھ اس میں سمائی ہوئی ہے۔ اس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہے۔ کہ اس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔

وہ بجز کوڑے پر کی گھانس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا۔ کہ باغ کیوں بنا ہے۔ اور پھول کیوں کھلا ہے۔ نرگس کیا دیکھتی ہے۔ اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے۔

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے۔ کہ جب تک وہ نہیں جاتا۔ کوئی ہنر و کمال اس میں نہیں آتا۔ تربیت و شائستگی۔ تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔ اور جبکہ وہ مذہبی غلط نمائی کے پردے میں ظہور کرتا ہے۔ تو اور بھی سم قاتل ہوتا ہے۔ کیونکہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ انسان کے خراب و برباد کرنے کے لئے شیطان کا سب سے بڑا داؤ تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتہ کو روشنی کا فرشتہ کر دکھلانا ہے۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے۔ کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچا۔ سچائی کو پسند کرنے والا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ ہماری نیتوں کو پہنچانتا ہے۔ پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے۔ چھوڑنا چاہیئے۔ تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں۔ ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے۔ پس اسی کی ہم کو پیروی چاہیئے۔

۳- تکمیل

ایک فارسی مثل مشہور ہے۔ کہ "ہر کمالے را زوالے"، مگر اس کے معنی اور اس کی وجہ بخوبی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایک اور بڑے حکیم نے اسی مطلب کو نہائیت عمدگی اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس کا یہ قول ہے کہ "ہم کو اپنے تئیں درجہ کمال پر پہنچا ہوا سمجھنا ہی زوال کی نشانی ہے" اور بلاشبہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی شخص یا قوم کسی بات میں اپنے تئیں کامل سمجھ لیتی ہے۔ تو اس میں سعی اور کوشش اور زیادہ تحقیقات اور نئی نئی باتوں کے ایجاد سے باز رہتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس چیز میں جس کو کامل سمجھا تھا۔ زوال آجاتا ہے۔

کامل مطلق بجز ذات باری کے اور کوئی نہیں ہے۔ پس جو کچھ کہ خدا نے کیا یا کہا وہ تو اپنی قسم میں کامل ہے۔ اور اس کے سوا اور کوئی چیز جو انسان کی ہو اور کہی ہو کامل نہیں ہے۔ کیونکہ قابل سہو و خطا ہونا انسان کی شان سے ہے۔ اگر یہ بات اس طرح پر نہ ہوتی تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہونے کی ضرورت نہ رہتی۔ پس ان تمام چیزوں کو جو انسان سے ایجاد ہوئی ہیں۔ یا نتائج عقل انسانی ہیں۔ ان کو کامل سمجھ لینا ہماری ٹھیٹ غلطی اور ہمارے تنزل اور ادبار کی ٹھیک نشانی ہے۔ کسی شخص یا کسی قوم کو کسی چیز میں کامل سمجھ لینا بہت سی خرابیوں اور نقصانوں کا باعث ہوتا ہے۔ جو چیز کہ حقیقت میں کامل نہیں ہے۔

ہم اس کو غلطی سے کامل سمجھ لیتے ہیں۔

ہم میں ایک استغنا پیدا ہوتا ہے۔ جس سے سوائے اس کے اور کسی بات یا تحقیقات کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اور اس بات کے فائدے سے محروم رہتے ہیں۔

لوگوں کے اعتراضوں کے سننے کو گوارا نہیں کرتے۔ اور اس سبب سے اپنی غلطیوں پر متنبہ نہیں ہوتے۔ اور جہل مرکب میں پھنسے رہتے ہیں۔ کوشش سے جو ایک ترقی کا زینہ ہے۔ اس کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں۔

خدا نے جو ہم کو عقل دی ہے۔ اور جس کو یہ فائدہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم اس کو کام میں لاویں۔ اوروں پر بھروسا کر کے اس کو بیکار کر دیتے ہیں۔

ایسا کرنے میں ہم صرف اپنا ہی نقصان نہیں کرتے۔ بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی بہت بڑا نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ ہماری اور ہماری آئندہ نسلوں کی عقل اور جودت طبع اور تیزی ذہن اور طاقت انتقال ذہنی اور قوت ایجاد سب مٹ جاتی ہے۔ اور صرف اوروں کی ہٹکاری پر ہماری چال رہ جاتی ہے۔ اور ہم ٹھیک اس مثل کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ "چارپائے بروکتابے چند"

ہم مسلمانوں نے اپنے میں اس نقص کو نہایت درجہ پر پہنچا دیا ہے اور جو نقصان دینی اور دنیوی اس سے ہم نے اٹھائے ہیں۔

ان کی کچھ انتہا نہیں ۔بھلا دینی باتوں کو اس وقت رہنے دو۔ اور صرف اس بات پر غور کرو ۔ کہ دنیوی علوم اور دنیوی کاروبار اور دنیا کی باہمی معاشرت اور مجالست اور رسوم و عادات اور طریقۂ تعلیم اور تربیت اور ترقی علم مجلس میں کیوں ہم نہ کوشش کریں۔ اور جس طرح اور قوموں نے ان باتوں میں ترقی کی ہے ۔ ہم بھی اسی طرح کیوں نہ ترقی کریں۔

ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا ۔ جو ہم اسکی علوم اور اس کے فلسفہ اور اسکے الٰہیات کو ناقابل غلطی کے سمجھیں۔ بو علی کچھ صاحب وحی نہ تھا۔ کہ اس کی طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں ۔ جو علوم دنیوی مدت دراز سے پڑھتے آتے تھے ۔ اور جو اپنے زمانہ میں ایسے تھے ۔ کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ۔ انہی پر پابند رہنے کے لیے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا ۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھ نہ کھولیں ۔ اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدا تعالےٰ کی عجائب قدرت کے نمونے ہیں ۔ اور جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں ۔ ان کو کیوں نہ دیکھیں۔

یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے ۔ یہ صرف خیالی ہی باتیں نہیں ہیں ۔ بلکہ اس وقت دنیا میں ہمارے سامنے اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں ۔کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں ۔ جن میں سے ایک نے اپنے باپ دادا کو درجہ کمال پر پہنچا ہوا اور ناقابل سہو و خطا سمجھ کر ان کے علوم و فنون اور طریق معاشرت کو کامل سمجھا اور

اسی کی پیروی کرتے رہے۔ اور اس کی ترقی اور بہتری پر نئی نئی چیزوں کے اخذ و ایجاد پر کچھ کوشش نہیں کی۔ اور دوسری نے کسی کو کامل نہیں سمجھا۔ اور ہمیشہ ترقی میں اور نئے نئے علوم و فنون و طریقہ معاشرت کے ایجاد میں کوشش کرتی رہی۔ اب دیکھ لو۔ کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ اور کون تنزل اور کون ترقی کی حالت میں ہے۔

ہندو اور مسلمان وہ قومیں ہیں۔ جو پچھلی لکیر کو کامل سمجھ کر اسی کو پیٹتے آتے ہیں۔ انگریز۔ فرنچ اور جرمن ایسی قومیں ہیں۔ جو ہمیشہ ترقی کی کوشش میں ہیں۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ وہ پہلی قومیں علم و ہنر و تربیت و شائستگی میں اپنے دور میں اپنی ہمعصر قوموں سے مقدم اور اعلیٰ تھیں۔ اور شائد مسلمانوں کو یہ بھی عزت تھی۔ کہ وہ یورپ کی بعض قوموں کے لئے بمنزلہ استاد کے گنے جاتے تھے۔ مگر اسی عیب نے جو ان قوموں میں تھا۔ اور اب بھی ہے۔ اور اسی خوبی نے جو پچھلی قوموں میں تھی۔ اور اب بھی ہے۔ ٹھیک ٹھیک معاملہ بالعکس کر دیا ہے۔ اب یورپ کی قومیں ایشیا کی قوموں سے علم و ہنر تربیت و شائستگی میں اعلیٰ ہیں۔ پس میرا مطلب صرف یہی ہے کہ ہماری قوم کو بھی چاہیئے کہ اپنے دماغ کو ان بیہودہ اور لغو خیالات سے جنہوں نے ان کی عقل اور سمجھ کو بالکل خراب کر رکھا ہے۔ اور ان کی تمام خوبیوں کو خیالات فاسد کے کیچڑ میں لتھڑا رکھا ہے

کردیا ہے۔خالی کریں۔ اور علوم وفنون اور تہذیب وشائستگی میں ترقی کرنے کی کوشش کریں۔ اور انصاف سے دیکھیں۔کہ ان کی تہذیب و شائستگی میں نقصان ہونے کے سبب سے ان کی قوم کی کیسی بدنامی ہے اور ان عمدہ اخلاق اور قواعد کو جو خدا تعالیٰ نے مذہب اسلام کی بدولت ان کو دیئے تھے۔ بُری طرح سے استعمال میں لانے اور ان کو بدصورت کر دینے سے غیر قومیں اسلام کو ہماری نالائقی کی بدولت کیسی حقارت اور نفرت سے دیکھتی ہیں۔کیسے خندہ زن اشارات اور کنایات اس پر کرتی ہیں۔اور ہماری شامت اعمال کو نتیجہ مذہب اسلام ٹھہراتی ہیں۔ ان کا ایسا کہنا اور خیال کرنا کچھ بھی بیجا نہیں ہے اسلام کوئی مٹی کا پتلا نہیں ہے۔جس کا کوئی دیکھ سکے مسلمانوں کی حالت اور ان کے چال چلن سے اسلام کی صورت دکھائی دیتی ہے سو انہوں نے اس کو ایسا بدصورت بنایا ہے۔کہ جو کوئی نفرت کرے کچھ تعجب نہیں۔پس اب میری یہ خواہش ہے۔کہ مسلمان اپنے اخلاق اور تہذیب وشائستگی کی درستی میں کوشش کرکر اور اپنے حال اور چال چلن کو درست اور عمدہ کرکر اسلام کی جو اصلی صورت ہے۔ وہ دُنیا کو دکھا دیں۔

۴۔رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات

ہم اپنے اس آرٹیکل کو بعض بڑے بڑے حکیموں کی تحریروں سے

اخذ کر کر لکھتے ہیں۔ کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے۔ کہ انسان کی زندگی کا منشا یہ ہے۔ کہ اس کے تمام قوئی اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں۔ اور ان میں باہم نامناسبت اور تناقض واقع نہ ہو۔ بلکہ سب کامل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہوئے مگر جس قوم میں کہ پرانی رسم اور رواج کی پابندی ہوتی ہے۔ یعنی ان رسموں پر چلنے والا مطعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ وہاں زندگی کا منشا معلوم ہو جاتا ہے۔

ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے۔ ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے۔ پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس کا کوئی چلتا ہے خاص اس کی خصلت پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسم ورواج پر مبنی ہے۔ تو وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے۔ اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے۔ تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے۔ وہ جزو بھی نہیں ہوتا ہے۔

کسی شخص کی یہ رائے نہ ہوگی۔ کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہئیے۔ اور نہ کوئی شخص یہ کہیگا۔ کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بھی نہ کرنی چاہیئے۔ سیدھا طریقہ یہ ہے۔ کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہیئے۔ کہ

اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں۔ ان کے فوائد سے مستفید ہو۔ اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہنچے۔ تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے۔

بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں۔ آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدا تعالےٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنائیت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں۔ صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے۔ جبکہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے۔ وہ شخص اس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا۔ اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کا اور تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے شخص کے لئے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے۔ اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔ البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے۔ وہ اپنی تمام قوتوں کے کام لیتا ہے۔ زمانہ حال پر نظر کرنے کے لئے اسکو قوت تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار غور کرنے کے لئے قوت تجویز اور اس کا تصفیہ کرنے کو

قوت استقراء اور بُرا بھلا ٹھہرانے کو قوت امتیاز اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اُس پر قائم رہنے کے لئے قوت استقلال اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں۔ آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے۔ جو اس کے واسطے مقرر کر دیا ہے۔ اسی کو انجام دیا کرے۔ بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے۔ جو ان اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں۔ اور جن کے سبب وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے۔ ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے پھولے اور پھلے۔

جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں۔ اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ مفید ہیں۔ اُن کو اختیار کریں۔ جو قابل اصلاح ہوں ان میں ترمیم کریں۔ اور جو بُری اور خراب ہوں۔ ان کی پابندی چھوڑ دیں۔ نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اسی سے لپٹے رہیں۔

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بُری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں۔ ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اس نے رسومات کی پابندی نہیں کی۔ بلکہ یہ باعث ہے۔ کہ اس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان

ایمان ضعیف نہ ہو جاوے وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو [illegible] باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانہ میں ہر شخص اعلےٰ سے لیکر ادنےٰ تک رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا۔ کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند اور ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے۔ یا جو عمدہ عقلیں مجھ میں ہیں۔ ان کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے۔ اور کونسی بات انکی ترقی اور شگفتگی کی معاون ہے۔ بلکہ وہ اپنے دل سے پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبے کے کونسی چیز مناسب ہے۔ میرے رتبے اور مقدور کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہوا۔ تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے۔ اور یوں پوچھتا ہے۔ کہ جو لوگ مجھ سے برتر ہیں۔ اور رتبہ اور مقدور میں زیادہ ہیں۔ وہ کن رسموں کو بجالاتے ہیں۔ تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کرا انہیں ہی کی سی شان میں شامل ہو۔

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ جو لوگ اس طرح پر رسومات کو بجالاتے ہیں۔ سو وہ اپنی خواہش اور مرضی سے ان رسومات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ترجیح دیکر پسند کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے۔ اور کسی بات کی خواہش کرنے کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا۔ اور اس لئے طبیعت خود متحمل اور مطیع رسموں کی پابندی

ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی ہوتی ہیں۔ اُن میں بھی اَوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال اوّل دل میں آتا ہے۔ غرضکہ اُن کی پسند وہی ہوتی ہے۔ جو عام پسند ہوں۔ اور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم و رواج کے مطابق نہ ہو۔ اُس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے۔ جیسے کہ جرموں سے یہاں تک کہ اپنی خاص طبیعت کی پیروی نہ کرتے۔ اِن میں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی۔ کہ جس کی پیروی کریں۔ اَور اِن کی ذاتی قوتیں بالکل نیز بیکار رہنے کے سبب بالکلیہ ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ شخص اپنی دلی خواہش کرنے اَور اپنی ذاتی خوشی اٹھانے کے قابل نہیں رہتے! اور عموماً ایسی طبعزاد رائیں یا خیالات نہیں رکھتے۔ جو خاص ان کی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں اب غور کرنا چاہیئے۔ کہ انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہے یا نہیں؟

رسومات جو مقرر ہوئی ہیں۔ غالباً اس زمانہ میں جبکہ وہ مقرر ہوئیں مُفید تصوّر کی گئی ہوں۔ مگر اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے۔ ان کا تجربہ صحیح نہ ہو۔ یا اِن کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو۔ یا اس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہُوا ہو۔ یا وہ رسم اس وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو۔ الاّ حال کے زمانہ میں مُفید نہ رہی ہو۔ بلکہ مضر ہو۔ یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو۔ غرض کہ رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے۔ اگر کوئی نقصان نہ ہو۔ تو یہ نقصان تو ضرور ہے۔ کہ آدمی کی عقل اور دانش اَور جودت طبع اور قوت ایجاد باطل ہو جاتی ہے۔

یہ بات بیشک ہے کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی۔ بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے۔ جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے ہیں لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بڑا فرق ہے۔ رسومات کی پابندی میں اس کی بھلائی و برائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے اور دوسری حالت میں بوجہ پسندیدہ ہونے کے اور اس لئے دوسری حالت میں جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں وہ معدوم و مفقود نہیں ہوئیں۔ الا پہلی حالت میں معدوم و نابود ہو جاتی ہیں۔ رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے چنانچہ وہ پابندی ایسی قوت طبعی کے جس کے ذریعے سے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے برابر مخالف رہتی ہے اور انسانوں کی تنزل حالت کا اصلی باعث ہوتا ہے

اب اس رائے کو دنیا کی موجودہ قوموں کے حال سے مقابلہ کرو۔ تمام مشرقی یا ایشیائی ملکوں کا حال دیکھو کہ ان ملکوں میں تمام باتوں کا انحصار رسم و رواج پر ہے۔ ان ملکوں میں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے پس اب دیکھو کہ مشرقی یا ایشیائی قوموں کا حال جن میں مسلمان بھی داخل ہیں۔ کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل ہے۔

ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوت عقل۔ جودت طبع

اور مادۂ ایجاد ضرور موجود ہوگا جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں جو اب رسمیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حسن معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ یہ سب باتیں انھوں نے اپنی محنت اور علم اور عقل اور جودت طبع سے ایجاد کی تھیں اور انہیں وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی اور قوی اور مشہور قوموں سے ہو گئے تھے۔ مگر اب ان کا حال دیکھو کہ کیا ہے۔ اسی رسومات کی پابندی سے ان کا مآل یہ ہوا ہے۔ کہ اب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں۔ جن کے آبا و اجداد اس وقت جنگلوں میں آوارہ پھرتے تھے۔ جس وقت ان قوموں کے آبا و اجداد عالیشان محلوں میں رہتے تھے۔ اور بڑے بڑے عبادت خانے اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے۔ اس کا سبب یہی تھا۔ کہ اس زمانہ میں ان قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی۔ اور جو کسی قدر تھی تو اس کے ہمراہ ہی آزادی اور ترقی کا جوش ان میں قائم تھا۔

تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہوتی ہے مگر یہ دیکھنا چاہیئے کہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جبکہ اس قوم میں وہ قوت اٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے۔ بلکہ میں نے غلطی کی کیونکہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گذر گیا اور تنزل اور ذلت و خواری کا

زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہنچ گیا ہے ۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں بہت سی رسمیں ہیں اور ان رسموں کی نہایت درجہ پابندی ہے تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں ۔

یہ اعتراض سچ ہے اور درحقیقت یورپ میں بھی رسموں کی پابندی کا نہایت نقصان ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی جیسے کہ اب تک ہوتی رہی ہے تو ان کو بھی بدنصیبی کا دن پیش آوے گا مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں کی پابندی رسومات میں ایک بڑا فرق ہے۔ یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو تو مانع ہے مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے اور سب لوگ پسند کریں فی الفور پرانی رسم چھوڑ دی جاویگی۔ اور نئی رسم اخذ کر لی جاویگی۔ اور اس سبب سے ان لوگوں کے قوائے عقلی اور حالت تمیز اور قوت ایجاد ضائع نہیں ہوتی ۔

تم دیکھو کہ یہ پوشاک جو اب انگریزوں کی ہے انکے باپ دادا کی نہیں ہے بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے۔ ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا اس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے اور ضروری سمجھا گیا ہے کہ ہر ایک شخص ایک سا مثل اوروں کی لباس پہنے۔ اسوقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ پر نہیں ہے ۔ کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اس کے برخلاف مگر اس سے عمدہ ایجاد کرے اور لوگ اس پر اتفاق کریں۔ اسی وقت تبدیل نہ ہو سکے اور اسی تبدیلی کیساتھ انکی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی

رہتی ہیں اور تا وقتیکہ ان کی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جاویں وہ بدستور رہتی ہیں ملکی معاملات اور تعلیم میں بلکہ اخلاق میں بلکہ مذہب میں ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں پس یہ تصور کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے مگر دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے ۔

البتہ یورپ میں اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابل تعریف اور لائق خواہش کے ہے اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی ۔ وہی بات اسکی تنزل کا باعث ہو گی ۔ بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہیگی اور وہ یہ ہے کہ تمام انگریز جو حبّ وطن میں نامی ہیں ۔ اسبات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں ۔ کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہو جاویں ۔ اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحت حکومت کر دیں ۔ اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے جو حالات کہ اب خاص خاص لوگوں اور فرقوں کے پائے جاتے ہیں اور جن کے سبب ان کی خاص خاص عادتیں قائم ہوتی ہیں ۔ وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں ۔ انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ اور مختلف ہمسایوں کے لوگ اور مختلف پیشہ والے گویا جدی جدی دنیا میں رہتے ہیں ۔ یعنی سب کا طریقہ اور عادت جدا جدا تھی اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک ہی محلہ کے رہنے والے ہیں ۔ انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں اور ایک ہی

باتیں سنتے ہیں اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں اور ایک ہی سے حقوق اور آزادی سب کو حاصل ہے اور ان حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں ہیں اور مشابہت اور مساوات روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے۔ اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مساوات سے اسکو اور زیادہ وسعت ہوتی ہے تعلیم کے اثر سے تمام عام خیالات کے اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں اور عام ذخیرہ حقائق اور مسائل اور رایوں کا موجود ہے۔ اس پر سب کو رسائی ہوتی ہے آمد و رفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع اور شامل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسائش اور آرام کے وسیلے اور فائدے زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ اور ہر قسم کی عالی ہمتی بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے کام ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ہر شخص ان کے کرنے کو موجود مستعد ہوتا ہے کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے اور ان سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور امورات رنج و راحت یکساں ہوتے جاتے ہیں۔ اور بلاشبہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور ترقی پر پہنچنے کا یہی نتیجہ ہے۔ اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے۔ کہ

اس سے عمدہ نہیں ہو سکتا۔ مگر باوصف اسکے ہم اس نتیجہ کو بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے۔ باعث تنزل قرار دیتے ہیں تو ضرور ہم کو کہنا پڑے گا کہ کیوں یہ عمدہ نتیجہ باعث تنزل ہوگا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جب سب لوگ ایک سی طبیعت اور عادت اور خیال کے ہو جاتے ہیں تو انکی طبیعتوں میں سے وہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرنے اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعد حسن معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے۔ اور پھر ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے ✣

اس معاملہ میں ہم کو ملک چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے۔ چینی بہت لائق آدمی ہیں بلکہ بعض باتوں پر لحاظ کیا جائے تو عقلمند بھی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی خوش قسمتی سے ابتدا میں ہی ان کی قوم میں بہت اچھی اچھی رسمیں قائم ہوگئیں اور یہ کام ان لوگوں کا تھا جو اس قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے ✣

چین کے لوگ اس بات میں مشہور و معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش اور عقل کی باتیں ان کو حاصل ہیں ان کو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے کے واسطے اور اس بات کے لئے جن شخصوں کو وہ دانشمندی کی باتیں حاصل ہیں۔ ان کو بڑے بڑے عہدے ملیں نہایت عمدہ طریقے ان میں رائج ہیں اور وہ طریقے حقیقت میں بہت عمدہ ہیں۔ بلاشبہ جن لوگوں نے ایسا ایسا دستور قائم رکھا۔ انہوں نے انسان کی ترقی کے اسرار کو پالیا

اور اسلئے چاہیئے تھا کہ وہ قوم تمام دنیا میں افضل رہتی مگر برخلاف اس کے ان کی حالت سکون پذیر ہوگئی اور ہزاروں برس سے ساکن ہے ۔ اور اگر ان کی کبھی کچھ اور ترقی ہوگی تو بیشک غیر ملکوں کے لوگوں کی بدولت ہوگی اس خرابی کا سبب یہی ہوا کہ اس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہوگئی اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہو گئے اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں پڑ گئے ۔ اور اس سبب سے وہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے ۔ ان میں سے معدوم ہو گئیں ؛

پس جبکہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے جن کی رسومات بھی عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں ۔ بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلا خیال اور قوموں کے اختلاط سے آگئی ہے ۔ جس میں ہزاروں نقص و برائیاں ہیں پھر ہم ان رسموں کے پابند ہوں اور نہ ان کی بھلائی برائی پر غور کریں ۔ اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں بلکہ اندھا دھندی سے انہی کی پیروی کرتے چلے جاویں تو سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا حال کیا ہوگیا ہے اور آئندہ کیا ہونیوالا ہے ؛

ہماری نوبت چینیوں کے حال سے بھی رسومات کی پابندی کے سبب بدتر ہوگئی ہے اور اب ہم میں خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کر سکیں ۔ اسلئے بجز اسکے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک کا باعث ہو ۔ اور کچھ چارہ نہیں بعد اسکے کہ ہمارے

قوائے عقلیہ تحریک میں آجادیں اور پھر قوت ایجاد ہم میں شگفتہ ہو۔ تب ہم پھر اس قابل ہونگے کہ خود اپنی ترقی کے لئے کچھ کر سکیں ۔

مگر جب کہ ہم دوسری قوموں سے از راہ تعصب نفرت رکھیں۔ اور کوئی نیا طریقہ زندگی کا کہ وہ کیسا ہی بے عیب ہو اختیار کرنا صرف بسبب اپنے پار سم ورواج کی پابندی کے معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے ۔

مگر چونکہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ایک مذہب رکھتے ہیں جسکو ہم دل سے سچ جانتے ہیں۔ اس لئے ہم کو مذہبی پابندی ضروری ہے اور وہ اسی قدر ہے کہ جو معاشرت اور تمدن اور زندگی بسر کرنے اور دنیاوی ترقی کی اختیار کرتے ہیں۔ اسکی نسبت اتنا دیکھ لیں۔ کہ وہ مباحات شرعیہ میں سے ہے یا محرمات شرعیہ میں سے درصورت ثانی بلا شبہ ہم کو احتراز کرنا چاہیئے اور درصورت اول بلا لحاظ پابندی رسوم کے اور بلا لحاظ اس بات کے کہ لوگ ہم کو برا کہتے ہیں۔ یا بھلا اس کو اختیار کرنا ضرور بلکہ واسطے ترقی قومی کے فرض ہے ۔

خدا ہمہ مسلماناں را بریں کار توفیق دہاد۔ آمین

۵۔ عورتوں کے حقوق

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں۔ دونوں برابر حق رکھتے ہیں۔

کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جائے اگر تمثیلاً کہا جاوے کہ عورت انسان کے لئے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے۔ اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے۔ یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ آنے کے ہے۔ اور مرد بمنزلہ روپیہ کے۔ تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے با ایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جسقدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے۔ اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے۔ اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ انگلینڈ جو عورتوں کی آزادی کی بڑی حامی کار ہے۔ جب اس کے قانون پر جو عورتوں کے باب میں ہے نظر کی جاتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور لاالعقل اور لاشے سمجھا ہے +

انگلینڈ کے قانون کے بموجب عورت شادی کرنے کے بعد معدوم الوجود متصور ہوتی ہے اور ذات شوہر سے مبتل ہو جاتی ہے +

وہ کسی قسم کے معاہدہ کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اس لئے وہ کسی دستاویز کی جو اس نے خود اپنی مرضی سے بلا شوہر کی مرضی کے لکھی ہو۔ ذمہ وار نہیں ہو سکتی +

جو ذاتی اسباب اور مال و نقد و جائیداد قبل شادی عورت کی ملک ہو وہ سب بعد شادی کے بقبضہ شوہر آجاتی ہے +

جو جائداد کہ عورت کو وراثتاً قبل شادی کے یا بعد شادی کے ملی ہو اس سب پر اس کا شوہر تاحین حیات قابض ہو جاتا ہے اور

وہی اس کا محاصل لیتا ہے ۔
وہ مثل لاالعقل شخص کے نہ کسی پر دعوے کر سکتی ہے اور نہ اس
پر کوئی دعوے رجوع کر سکتا ہے۔
وہ بلا اجازت شوہر کے کوئی اسباب نہیں خرید سکتی - اور کوئی
چیز بیع نہیں کر سکتی ۔
وہ بجز روٹی کھانے اور کپڑا پہننے اور ایک مکان میں رہنے کے
خرچ کے جو ضروریات زندگی کے لئے درکار ہے اور کوئی خرچ بغیر
مرضی شوہر کے نہیں کر سکتی ۔
۱۸۷۰ء میں پارلیمنٹ میں منکوحہ عورتوں کی جائداد کا ایک بل پیش
ہوا تھا - اس میں صرف یہ بات چاہی گئی تھی - کہ وہ قانون جس کی رو سے بہ
شادی کے عورت اپنی جائداد سے محروم ہو جاتی ہے منسوخ کیا جاوے ۔
آنریبل مسٹر رسل گرنی ممبر پارلیمنٹ نے یہ مسودہ قانون پیش کیا تھا
اسوقت انہوں نے نہایت لطیف بات یہ کہی تھی کہ قانون کے بموجب جو
کچھ جائداد عورت کے پاس قبل شادی ہوتی ہے اور بعد شادی ملتی
ہے اور جو کچھ کہ وہ اپنی محنت و لیاقت سے کماتی ہے بعد شادی کے
وہ اس کا نہیں رہتا - سب پر شوہر مالک ہو جاتا ہے پس شادی کا اثر
عورت پر ایسا ہوتا ہے جیسا کہ کسی جرم قابل ضبطی جائداد کا ہوتا ہے :
اس گفتگو پر تمام ہوس آف کامنز ہنس پڑا اور اکثر ممبروں نے
آنریبل مسٹر گرے کی تائید کی - پس انگلستان کے قانون کا عورت

کی نسبت یہ حال ہے اور غالباً کوئی قانون اس سے زیادہ خراب اور مضرت رساں اور ناانصاف نہ ہوگا۔

۶۔ تعلیم و تربیت

ایک مصنف کی ایک بات کو ہم اپنی طرز پر اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

تعلیم اور تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے بلکہ وہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔ جو کچھ کہ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا اس کی تربیت کرنا ہے۔ مثلاً جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اسکی تربیت ہے۔

انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ اس کے سوتوں کو کھولنا اور اندر کے سرچشمہ کے پانی کو باہر نکالنا ہے جو صرف اندرونی قوائے کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے۔ اور انسان کو تربیت کرنا اس کے لئے سامان مہیا کرنا اور اس سے کام کا لینا ہے۔ جیسے جہاز تیار ہونے کے بعد اس پر بوجھ لادنا اور حوض بنانے کے بعد اس میں پانی کا بھرنا۔ پس تربیت پانے سے تعلیم کا بھی پانا ضرور نہیں ہے۔ تربیت جتنی چاہو کرو اور اس کے دل کو تربیت کرتے کرتے منہ تک بھردو۔ مگر اس سے دل کی سرچی سوتیں نہیں کھلتیں

بلکہ بالکل بند ہو جاتی ہیں۔ اندرونی قوئے کو حرکت دیئے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ ایک شخص کی تربیت تو بہت اچھی ہو اور تعلیم بہت تھوڑی۔ یہی ٹھیک ٹھیک حال ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے کہ تربیت تو نہایت اچھی ہے اور تعلیم کچھ نہیں۔ ظاہر میں دیکھو تو طمطراق بہت کچھ مگر جب اصلیت ڈھونڈو تو کچھ نہیں۔ بھاری بھر کم تو عمامہ و دستار و جبہ او رکرتہ سے بہت کچھ مگر دل کی اور اندرونی قوئے کی شگفتگی دیکھو تو کچھ ہی نہیں نہایت عمدہ قول ہے کہ کتابوں کا پڑھا دینا تو تعلیم کا نہایت ادنیٰ اور سب سے حقیر جزو ہے۔ بلکہ اس قسم کے بہت سے پڑھنے سے جسمیں اندرونی قویٰ کی تحریک اور شگفتگی نہ ہو جس قدر دل کے قویٰ کمزور اور ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے اور کسی چیز سے نہیں ہوتے ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں کہ ان کے روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر وغیرہ اور اپنے آپ کو بمثل و بنظیر قابل ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں کتابیں پڑھتے ہیں اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم پہنچیں ان کو اور زیادہ پڑھتے ہیں اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اور ایسے بیل کی مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے اور پھر بھی چراگاہ میں ہی رہنے کی خواہش کرتا ہے پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی بلکہ وہ کتابیں علم خود ان پر بوجھ ہوتا ہے ؎

اس تقریر سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ تمام خرابیوں کی جڑ جو ہم پر نازل ہیں یہی ہے کہ ہم نے اپنے دل کو اور اپنے اندرونی قویٰ کو بالکل خراب کردیا ہے۔ علم جو حاصل کرتے ہیں وہ بھی بعوض اسکے کہ اندرونی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے۔ ان کو پژمردہ کردیتا ہے اور ہمارے قویٰ کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں بالکل کمزور اور ناکارہ کردیتا ہے اور ہماری حالت تمام معاملات میں کیا دین کے اور کیا دنیا کے خراب ہوتی چلی جاتی ہے پس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہیئے۔ اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہیئے۔ جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے اور دل کی سوتوں کو کھول کر سرچشمہ سے پانی باہر نکالے جس سے ہماری زندگی سرسبز و شاداب ہو +

۷۔ کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا کام کاج محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے +

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لئے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے۔ کہ بمجبوری اس کے لئے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے اور اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنیوالے لوگ

اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا ان کی طبیعت ثانی ہو جاتی ہے مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں۔ اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقعہ ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے لیکن اگر انسان ان عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قویٰ کو بیکار ڈال دے۔ تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اس کے دلی قویٰ کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی۔ تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بیکار نہ چھوڑے

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اسکے اخراجات کو مناسب ہو اور اس کے حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے جیسے کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج داروں کا حال تھا اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بیکار ڈال دے تو اس کا حال کیا ہوگا۔ یہی ہوگا۔ کہ اسکے تمام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاوینگے شراب پینا اور مزیدار کھانا اس کو پسند ہوگا۔ قمار بازی اور تماش بینی کا

عادی ہوگا اور یہی سب باتیں اسکے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ و باسلیقہ وحشی ہوتے ہیں اور یہ ایک وضعدار وحشی ہوتا ہے شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا اور پیچوان کے دھوئیں اڑانا اسکو پسند ہوتا ہے اور جنگل کے ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دھوئیں اڑانا اسکو پسند ہوتا ہے پس پیچوان اور ناریل اور بچھونے اور ریت کے فرق سے کچھ مشابہت میں جو ان دونوں میں ہے کمی نہیں ہوتی ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لئے ایسے کام بہت کم ہیں جن میں ان کو قوائی دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے اور برخلاف اس کے اور ولائتوں میں اور خصوصاً انگلستان میں وہاں کے لوگوں کے لئے ایسے موقعے بہت ہیں۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں۔ کہ اگر انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اس کا شوق نہ رہے جیسا کہ اب ہے تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاوینگے مگر ہم اپنے ہموطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو قوئی دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے یعنی اپنے دلی قوئ کو بیکار چھوڑ دیا ہے اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم اسی کی فکر اور کوشش چاہیئے کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہوا مگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اسی کی فکر اور کوشش چاہیئے۔ کہ وہ قصور کیونکر رفع ہو۔ غرضکہ کسی شخص کے دل کو بیکار پڑا رہنا نہ چاہیئے کسی نہ کسی بات

کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بیکار پڑا رہنا نہ چھوٹے گا، اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے نہایت حکیمانہ قول ہے کہ

بیکار مباش کچھ کیا کر ؛ گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر

۸- اخلاق

مسٹر اوڈلین کا قول ہے کہ مذہب کے دو حصے ہو سکتے ہیں ایک اعتقادیات دوسرا عملیات۔ مسٹر اوڈلین کی غرض اعتقادیات سے صرف وہ مسائل ہیں جو وحی سے معلوم ہوئے اور جو عقل سے یا کارخانہ قدرت پر غور کرنے سے معلوم نہیں ہو سکتے مگر ہم کو ان کے اس بیان سے کسی قدر اختلاف ہے ہم اعتقادیات ان مسائل کو کہتے ہیں جن کا ہونا عقل و نیچر یعنی کارخانہ قدرت کے اصول پر ناممکن نہیں ہے۔ الا ہم ان دونوں کی بنا پر ان کے ہونے کا یقین نہیں کر سکتے تھے۔ وحی نے صرف ان کے ہونے پر جب وہ ہوں ہم کو یقین دلایا ہے کہ یا ان کا ہونا بتایا ہے ہم نے اس مقام پر حرف تردید کو اسلئے استعمال کیا ہے کہ ہم کو اس بات میں شبہ ہے کہ ان مسائل جن کو ہم نے اعتقادات میں داخل کیا ہے یقین لانا جزو ایمان ہے یا نہیں۔ عملیات میں مسٹر اوڈلین نے ان مسائل کو داخل کیا ہے جنکو عقل و نیچر کے مطابق مذہب نے بھی ہدایت کی ہے۔ پس وہ پہلے حصے کا نام

عقاید رکھتے ہیں اور دوسرے حصے کا نام اخلاق۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ ہم اکثر لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ کہ وہ اعتقادیات پر اس قدر خیال کرتے ہیں کہ اخلاق کو بالکل بھول جاتے ہیں اور بعضے اخلاق پر ایسے متوجہ ہوتے ہیں کہ اعتقادیات کا کچھ خیال نہیں کرتے صاحب کمال آدمی کو ان دونوں میں سے کسی بات میں ناقص نہ رہنا چاہیے۔ جو لوگ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہر ایک سے کیا کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ دل سے ہمارے اس بیان کی تصدیق کریں گے۔

افسوس ہے کہ اس مقام پر بھی مجھ کو مسٹر اڈلین سے کچھ تھوڑا سا اختلاف ہے پچھلا حصہ اس کے مضمون کا نہایت سچ ہے۔ مگر پہلے حصے میں کچھ غلطی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعتقادیات میں اور عملیات میں جس کو مسٹر اڈلین اخلاق کہتے ہیں کچھ علاقہ نہیں ہے۔ انسان اعتقادیات پر کتنا ہی زیادہ خیال کرے اس کے اخلاق میں کچھ تفاوت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اخلاق پر کیسا ہی متوجہ ہو اس کے اعتقادیات میں کچھ نقصان نہیں آسکتا۔ کیونکہ یہ دونوں کام دو جدا جدا آلوں اور دو جدا جدا شخصوں سے متعلق ہیں۔ پہلا ہمارے دل یا ہماری روح اور خدا سے۔ دوسرا ہماری ظاہری حرکات اور جذبات اور انسان سے۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ گو مذہب اخلاق اور اعتقاد پر منقسم ہے اور ان دونوں میں خاص خاص خوبیاں ہیں مگر اخلاق کو اعتقاد پر اکثر باتوں میں ترجیح ہے۔

۱۔کیونکہ اخلاق کی اکثر باتیں نہایت صحیح اور بہت مضبوط ہیں یہاں تک کہ اگر اعتقاد بالکل قائم نہ رہے تب بھی وہ باتیں (یعنی اخلاق کے مسائل) بدستور قائم رہتے ہیں۔

۲۔جس شخص میں اخلاق ہے اور اعتقاد نہیں وہ شخص بہ نسبت اس شخص کے جس میں اعتقاد ہے اور اخلاق نہیں انسان کے لئے دنیا میں بہت زیادہ بہتری کر سکتا ہے اور میں اسقدر اور زیادہ کہتا ہوں کہ انسان کیلئے دین اور دنیا دونوں میں بہت زیادہ بھلائی کر سکتا ہے۔

۳۔ اخلاق انسان کی فطرت کو زیادہ کمال بخشتا ہے۔ کیونکہ اس سے دل کو قرار و آسودگی ہوتی ہے۔ دل کے جذبات اعتدال پر رہتے ہیں اور ہر ایک انسان کی خوشی کو ترقی ہوتی ہے۔

۴۔ اخلاق میں ایک نہایت فائدہ اعتقاد سے یہ ہے کہ اگر وہ ٹھیک ٹھیک ہوں تو تمام دنیا کی مہذب قومیں اخلاق کے بڑے بڑے اصولوں میں متفق ہوتی ہیں۔ گو کہ عقائد میں وہ کیسی ہی مختلف ہوں۔

۵۔ کفر سے بھی بداخلاقی زیادہ بدتر ہے۔ یا اس مطلب کو یوں کہو کہ اکثر لوگوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک نیک چلن نپٹ جاہل وحشی جس کو خدا کی باتوں کی کچھ خبر بھی نہیں پہنچی نجات پا سکتا ہے مگر بدچلن معتقد آدمی نجات نہیں پا سکتا۔

۶۔ اعتقاد کی خوبی اسی میں ہے کہ اس کا اثر اخلاق پر ہوتا ہے۔ اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ اعتقاد کی یعنی خدا کے دیئے ہوئے مذہب پر ایمان

رکھنے کی خوبیاں کیا ہیں تو کیا ہم کو اس بات کی صحت جو ہم نے ابھی بیان کی بخوبی معلوم ہو جاویگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کی خوبیاں ان باتوں میں ہیں۔ جن کو میں بیان کرتا ہوں۔

۱۔ اخلاق کی باتوں کو سمجھنا اور ان کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانا۔

۲۔ نیک اخلاق پر عمل کرنے کے لئے نئے نئے اور قومی قوی اغراض کو بہم پہنچانا۔

۳۔ خدا کی نسبت عمدہ خیالات پیدا کرنا اور اپنے ہمجنسوں میں اچھا برتاؤ کرنا جس سے آپس میں محبت زیادہ ہو اور خود انسان اپنی سچی حالت کو کیا بلحاظ اپنے نیچر کی خوبی کے اور کیا بلحاظ اس کی بدی کے بخوبی سمجھے۔

۴۔ برائی کی برائیوں کو ظاہر کرنا۔

۵۔ نجات کیلئے نیک اخلاق کو عام ذریعہ ٹھہرانا۔

مذہب کی خوبیوں کا یہ ایک مختصر بیان ہے۔ مگر جو لوگ اس قسم کے مباحث میں مشغول رہتے ہیں وہ نہایت آسانی سے ان خیالوں میں ترقی دے سکتے ہیں اور مفید نتیجے ان سے نکال سکتے ہیں۔ مگر میں یقیناً کہہ سکتا ہوں۔ کہ ان سب باتوں کا ظاہر نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اخلاق میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اخلاق کو عیسائی مذہب کا سہارا نہ ہو یہ قول مسٹر اڈیسن کا ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ کوئی اعتقاد یا کوئی مذہب سچا ہو ہی نہیں سکتا جس کا نتیجہ اخلاق کی عمدگی نہ ہو۔ پس اخلاق کو کسی مذہب کا کچھ سہارا درکار نہیں ہے بلکہ مذہب یا اعتقاد کے سچ سمجھنے کو اخلاق کا سہارا درکار ہے

مسٹر اڈلین اور بھی دو ایک اصول قائم کرتے ہیں جو اس گفتگو سے علاقہ رکھتے ہیں۔

۱۔ دیکھتے ہیں کہ ہم کو ایسی بات کو اعتقاد کی جڑ نہ قرار دینا چاہیے جس سے اخلاق کو استحکام اور ترقی نہ ہوتی ہو۔

۲۔ کوئی اعتقاد صحیح بنیاد پر ہو ہی نہیں سکتا۔ جس سے اخلاق خراب یا ان میں تنزل ہوتا ہے۔

یہ دونوں اصول مسٹر اڈلین کے ایسے عمدہ ہیں کہ دنیا میں کوئی شخص جسکے دل کی آنکھ خدا نے اندھی نہ کی ہو ان سے انکار نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد مسٹر اڈلین انہیں اصولوں پر ایک اور مسئلہ متفرع کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تمام مشتبہ مقاموں میں ہم کو غور کرنی چاہیے کہ اگر بالفرض وہ غلط ہو تو اس سے کیا کیا بد نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً اپنے ایمان کے مضبوط کرنے اور خیالی ثواب حاصل کرنے کی امنگ میں لوگوں کو تکلیف دینا لوگوں کے دلوں میں رنج اور نفرت غصہ اور سخت عداوت پیدا کرنا اور جس چیز پر ان کو اعتقاد نہیں ہے۔ بہ زبردستی ان سے قبول کروانا ایسے جذبات میں ہم اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ ان سب باتوں کے سوا ہم ان کو دنیا کے فائدہ اور خوشی سے بھی محروم کرتے ہیں ان کے جسم کو تکلیف دیتے ہیں ان کی دولت کو خراب کرتے ہیں ان کی ناموریوں کو خاک میں ملاتے ہیں ان کے خاندانوں کو برباد کرتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کو تلخ کر ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخرکار ان کے مار ڈالتے ہیں۔ پس جب کسی مسئلہ سے ایسے

بد نتیجے نکلیں تو مجھ کو اس مسئلہ کے مشکوک ہونے میں کچھ شبہ نہیں رہتا۔ جیسے کہ علم حساب میں دو اور دو چار ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہوتا پس ایسے مسئلہ کو اپنے مذہب کی بنیاد نہیں ٹھہرا سکتا۔ اور نہ اس پر عمل کر سکتا ہوں ٭

اس قسم کے معاملات میں ہم صریح اپنے ہمجنسوں کو ضرر پہنچاتے ہیں اور جس مسئلہ سے ہم ایسا کرتے ہیں۔ بلاشبہ وہ مشکوک اور قابل اعتراض ہے۔ اخلاق اس سے بالکل خراب ہو جاتے ہیں ٭

یہ مضمون مسٹر اڈلین کا غالباً عیسائی مذہب کے اس زمانہ پر اشارہ ہے جب کہ رومن کیتھلک اور پراٹسٹنٹ فرقہ میں دشمنی کی آگ میں جلائے جاتے تھے۔ اور نہایت بدبخت خونریزیاں جو درحقیقت کہ سچائی کے بالکل برخلاف ہو رہی تھیں ٭

لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہب میں بھی ایسا ہی خونخوار امن اور اخلاق کے برخلاف جہاد کا مسئلہ ہے اگر وہ مسئلہ درحقیقت ایسا ہی ہو جیسا کہ بعض یا اکثر حقیقت تک نہ پہنچنے والے یا خود غرض لوگوں نے سمجھا ہے یا اکثر ظالم و مکار مسلمان حکمرانوں نے برتا ہے تو اس کے اخلاق کے برخلاف ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے مگر ہمارا اعتقاد یہ نہیں ہے بلکہ جو حقیقت جہاد کی درحقیقت مذہب اسلام کی رو سے ہے وہ اخلاق کے برخلاف نہیں ہے اس میں کسی قسم کا جبر یا کسی کے مذہب کو بجبر چھڑانا یا مذہب کے لئے کسی کا خون بہانا مطلق نہیں ہے وہ صرف نیشنل لا پر

یعنی اس قانون پر مختلف قوموں کو آپس میں برتنا چاہیئے۔ مبنی ہے اور جو آج کل سے مہذب قوموں میں جاری ہے۔

اس مسئلہ کا ذکر ہم نے اپنی متعدد تصنیفات میں کیا ہے اور امید ہے کہ کبھی اس مضمون پہ کوئی تحریر اس پرچہ میں بھی چھاپیں گے ؛

مسٹر اڈیسن اپنے اس مضمون کو کسی مصنف کے نہایت عمدہ اور دل میں اثر کرنے والے کلام پر ختم کرتے ہیں۔ اور وہ کلام یہ ہے آپس میں نفرت پیدا کرنے کو تو ہمارے لئے مذہب کافی ہے مگر ایک دوسرے میں محبت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں۔

میں اسبات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جو برتاؤ مذہبوں کا اس زمانہ میں ہے وہ ایسا ہی ہے اور مسلمانوں کا برتاؤ سب سے زیادہ بُرا ہے مگر سچے مذہب کا یعنی اسلام کا سچا مسئلہ یہ ہے کہ "خدا کو ایک جاننا اور انسان کو اپنا بھائی سمجھنا" پس جو کوئی اس مسئلہ کے برخلاف ہے وہ غلطی پر ہے۔

۹۔ ریا

دنیا میں ایسے لوگ بہت ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ دنیا دار اور رند مشرب آدمی جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں۔ اس سے زیادہ اپنے تئیں وہ بد بناتے ہیں۔ دینداری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر کہ ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ نیک اپنے آپ کو بتلاتے ہیں وہ تو دینداری کی ذرا ذرا سی باتوں سے بھی بھاگتے

ہیں اور دن رات عشق و تماش بینی اور ٹیچ پنے کی باتوں کی جن کو در اصل انہوں نے کیا بھی نہیں گپیں اڑاتے ہیں اور یہ حضرات بیشمار گناہوں اور بدیوں کو ایک ظاہری دینداری کے پردہ میں چھپاتے ہیں اور ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں برے نہیں ہیں۔ مگر ایک اور تیسری قسم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں اور انہیں کا کچھ ذکر میں اس تحریر میں کرنا چاہتا ہوں ان کی بناوٹ ایک اور ہی عجیب قسم کی ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں ہی کو فریب نہیں دیتے۔ بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکا میں پڑتے ہیں وہ بناوٹ خود ان سے انہیں کے دل کے حال کو چھپاتی ہے جس قدر کہ درحقیقت وہ نیک ہیں۔ اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے پھر تو وہ لوگ یا اپنی بدیوں پر خیال ہی نہیں کرتے یا ان بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داؤد نے نہایت دلچسپ لفظوں میں اس برائی سے پناہ مانگی ہے اور اسطرح پر خدا کی مناجات کی ہے " کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں سے پاک کر"۔ جو لوگ علانیہ بدی کرتے ہیں اگر ان کو بدیوں اور گناہوں سے بچانے کے لئے نصیحت کی ضرورت ہے تو وہ لوگ جو درحقیقت موت کی راہ چلتے ہیں۔ اور اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے راستہ پر سمجھتے ہیں کس قدر رحم کے لائق ہیں اور کتنی نصیحت کے محتاج ہیں پس میں چند قاعدے بیان کرنا چاہتا ہوں جن سے وہ بدیاں جو دل کے کونوں میں چھپی ہوئی ہیں اور جن کے چھپے رہنے سے انسان اپنے دل کا سچا حال آپ نہیں جان سکتا

معلوم ہوسکیں۔

عام قاعدہ تو اس کے لئے یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو ان مذہبی اصولوں سے جو ہماری ہدایت کے لئے مقدس کتاب اللہ میں لکھے ہیں جانچیں اور اپنی زندگی کو اس پاک شخص کی زندگی سے مقابلہ کریں جس نے یہ فرمایا کہ " اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ " اور جو اس درجہ کمال تک پہنچا۔ جہاں تک انسان کا پہنچنا ممکن ہے اور جس کی زندگی ہماری زندگی کے لئے نمونہ ہے اور جو اپنی پیروی کرنے والوں کے لئے بلکہ تمام دنیا کے لئے بڑا ہادی اور بہت بڑا دانا استاد ہے ان دونوں قاعدوں کے برتنے میں بڑی بڑی غلطیاں پڑتی ہیں کچھ تو لوگوں کی سمجھ میں غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ آپس میں اختلاف رائے ہوتا ہے جو بن ہوئے رہ نہیں سکتا۔ اور کچھ زمانہ کے گزرنے سے ٹھیک ٹھیک حالت اور کیفیت ان واقعات کی جو گذرے معلوم نہیں ہو سکتی اس لئے برخلاف اگلے مسلمان مصنفوں کے صرف انہی قاعدوں کے بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اور بھی قاعدے بیان کرتا ہوں جو انسان کو ٹھیک ٹھیک مطلوبہ راہ پر لے آتے ہیں۔

اپنے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے کا ایک عمدہ قاعدہ یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں ہمارے دوست اکثر ہمارے دل کے موافق ہماری تعریف کرتے ہیں یا تو ہمارے عیب ان کو عیب ہی معلوم نہیں ہوتے۔ اور یا ہماری خاطر کو ایسا عزیز رکھتے ہیں کہ اس کو رنجیدہ نہ کرنے کے خیال سے ان کو چھپاتے ہیں یا ایسی نرمی سے کہتے ہیں کہ

ہم ان کو نہایت ہی خفیف سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے دشمن ہم کو خوب ٹٹولتا ہے اور کونے کونے سے ڈھونڈ کر ہمارے عیب نکالتا ہے۔ گو وہ دشمنی سے چھوٹی بات کو بہت بڑا کر دیتا ہے۔ مگر اکثر اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے۔ ع

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے۔ اور دشمن عیبوں کو۔ اس لئے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیئے کہ ہمکو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا۔ تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا۔ جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہیے تھا۔ دشمن جو عیب صحیح یا غلط ہم میں لگاتا ہے۔ ہمارے فائدے سے خالی نہیں۔ اگر وہ ہم میں ہوتا ہے۔ تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں۔ اور اگر نہیں ہوتا۔ تو خدا کا شکر کرتے ہیں۔ کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔ سچ ہے کہ دشمن از دوست ناصح تر است۔ این چیز نکوئی نہ گوید واین جز بدی نجوید۔

پلوٹارک کا دشمنی کے فائدوں پر جو مضمون ہے۔ اس میں اس نے یہ بات لکھی ہے۔ کہ دشمن جو ہم کو بدنام کرتے ہیں۔ اس سے ہم کو ہماری برائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اور ہماری گفتگو میں اور ہمارے چال چلن میں اور ہماری تحریروں میں جو نقص ہیں۔ وہ بغیر ایسے دشمن کی مدد کے کبھی معلوم نہیں ہوتے

علی ہذا القیاس اگر ہم خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں کہ ہم کیا ہیں۔ تو ہم کو اس بات پر غور کرنی چاہیئے کہ جو لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں۔ اس میں

ہم کس قدر کے مستحق ہیں۔ اور پھر یہ سوچنا چاہیئے۔ کہ جن کاموں کے سبب سے وُہ تعریف کرتے ہیں۔ وہ کام ہم عمدہ غرض سے اور نیک نیتی سے دنیا کو فائدہ پہنچانے کے لئے کرتے ہیں یا نہیں اور پھر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہیئے۔ کہ وہ نیکیاں جن کے سبب ہماری تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں، دراصل ہم میں کہاں تک ہیں۔ ان باتوں پر انسان کو بخوبی غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ہمارا یہ حال ہے کہ کبھی تو ہم لوگوں کی رایوں کو جو ہماری نسبت ہیں۔ پسند کر کر اپنے تئیں بہت بُرا سمجھنے لگتے ہیں۔ اور کبھی ان کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہمارا دل کہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ان تمام رایوں کو نہیں مانتے۔

ہم کو ایسی نیکی پر بھی جس کو ہم نے اپنے خیال میں نیک سمجھا ہے۔ مگر درحقیقت اس کی نیکی مشتبہ ہے۔ زیادہ اصرار کرنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ ان لوگوں کی رایوں کی بھی نہایت قدر و منزلت کرنی چاہیئے۔ جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اور جو عقلمند اور نیک دل ہیں۔ اور جس طرح ہم نیک دلی سے بات کہتے ہیں اسی طرح وہ بھی نیک دلی سے ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیئے۔ کہ ان اختلاف کرنے والوں نے صرف آزادی رائے اور اس دلی نیکی سے جس کے سرچشمہ کی سوت قدرت نے ہر ایک انسان کے دل میں کھولی ہے۔ اختلاف کیا ہے۔ یا کسی بیرونی دباؤ یا پابندی رسم و رواج اور تعصب اور تقلید نے ان کے دل کو پھیرا ہے۔ کیونکہ اگر یہ پچھلی بات اختلاف رائے کا سبب ہو تو وہ نہایت بے قدر ہو جاتی ہے۔

جہاں ہم کو دھوکا کھانے کا احتمال ہے۔ وہاں ہم کو نہایت ہوشیاری اور بہت خبرداری سے کام کرنا چاہیئے۔ حد سے زیادہ سرگرمی اور تعصب اور کسی خاص فرقہ کو یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو بُرا اور حقیر سمجھنا یہ ایسی باتیں ہیں۔ جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ فی نفسہٖ نہایت ہی بُری ہیں گو کہ وہ ہم سے کمزور دل آدمیوں کو اچھی معلوم ہوتی ہوں۔ مگر اس پر بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو دینداری اور نیکی کے لئے نہایت مشہور رہیں۔ مگر نہایت لغو اور بُرے شیطانی اصولوں کو نیکی سمجھ کر اپنے دلوں میں اس کی جڑ گاڑ دی ہے میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آج تک کوئی ایسا عقلمند اور انصاف پسند شخص نہیں دیکھا جس میں پوری پوری یہ سب باتیں ہوں اور پھر بھی وہ گناہ سے پاک ہو۔

اسی طرح ہم کو ان کاموں سے بھی ڈرنا چاہیئے۔ جو انسان کے کمزور دل کی قدرتی بناوٹ سے یا کسی خاص شوق سے یا کسی خاص تعلیم کے اثر سے یا کسی اور سبب سے ہوتی ہیں جس میں ہمارا دنیوی فائدہ ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی سمجھ نہایت آسانی سے حق بات کی طرف سے پھر جاتی ہے۔ اور اس کا دل غلطی کیطرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور یہی باتیں ہیں۔ جن کے سبب سے تعصب اور ہزاروں غلطیاں اور پوشیدہ بُرائیاں اور لامعلوم عیب انسان کے دل میں گھس جاتے ہیں۔ جس کام کے کرنے میں عقل کے سوا اور جذبوں کی بھی ترغیب ہو اس کے کرتے میں عقلمند آدمی کو ہمیشہ ڈرنا اور ہمیشہ اس پر شبہ کرنا چاہیئے۔ کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی بُرائی چھپی ہوئی ہے

ان اصولوں پر اپنے خیالوں کو جانچنا اور اپنے دل کو ٹٹولنا اور دل کے تاریک جذبوں کو ڈھونڈنا ہمارے لئے اس سے بڑھکر کوئی چیز مفید نہیں ہے اگر ہم اپنے دل میں ایسی مضبوط نیکی بٹھانی چاہیں۔ جو قیامت کے دن ہمارے کام آوے۔ جس دن کہ ہمارے بھیدوں کا جاننے والا ہمارے دل کو جانچے گا۔ جس کی عقل اور انصاف کی کچھ انتہا نہیں۔ تو ان اصولوں پہ چلنے سے بہتر ہمارے لئے کوئی راہ نہیں۔ ہمارے بانی اسلام نے جب ہم کو یہ سکھلایا ہے۔ کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ہمارے دل کے چھپے بھید کو جانتا ہے تو اس نے کس خوبی اور خوبصورتی سے اس ریاکاری کی بُرائی ہم کو بتلا دی جس سے انسان دنیا کو دھوکا دیتا ہے۔ اور خود اپنے آپ کو ہی فریب میں ڈالتا ہے۔ داؤد نے بھی اپنی مناجات میں اس ریاکاری کے خوف کو جس سے انسان خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ نہایت دلچسپ لفظوں میں ادا کیا ہے۔ جہاں اس نے کہا ہے کہ اے خدا مجھ کو جانچ میرے دل کی تہ کو ڈھونڈھ میرے خیالوں کو دیکھ مجھ کو بخوبی پرکھ کہ مجھ میں کس بُرائی نے راہ کی ہے اور مجھ کو اسی راہ پر لے چل جو ہمیشہ کو قائم رہے ؛

۱۰۔ مخالفت

دشمنی اور عداوت حسد اور رنجش اور ناراضگی کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے۔ جو خود اسی شخص میں کمینہ عادتیں اور رذیل اخلاق پیدا کرتا ہے اور بعوض اس کے کہ وہ اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہنچا دے۔ خود اپنا

آپ نقصان کرتا ہے۔ اس انسانی جذبہ کو ہم مخالفت کہتے ہیں۔
دشمنی اور عداوت کا منشا اکثر اتلاف حقوق کے سبب سے ہوتا ہے زن زمین یا زر۔ زمین یا خون اس جذبہ کے جوش میں آنے کے باعث ہوتے ہیں۔
حسد کا منشا صرف وہ اوصاف حمیدہ ہوتے ہیں۔ جو محسود میں ہیں اور حاسد ان کا خواہاں ہے۔ مگر وہ اس میں نہیں ہیں۔ اور نہ ہو سکتے ہیں۔
رنجش اور ناراضگی اکثر باہمی معاشرت میں خلل واقع ہونے سے ہوتی ہے مگر ان سب کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے۔ جو بغیر ان سببوں کے جوش میں آتا ہے۔ اس کا منشا نہ زر و زمین و زن کی دشمنی ہوتی ہے۔ اور نہ مخالف کے اوصاف حمیدہ کی خواہش ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ شخص اپنے مخالف کے اوصاف حمیدہ کو اوصاف حمیدہ ہی نہیں تصور کرتا اور نہ باہمی معاشرت کا خلل اس کا باعث ہوتا ہے اس لئے کہ اکثر ان دونوں میں ملاقات اور واقفیت بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ اسکی مخالف رائے یا عقل و سمجھ دوسرے فریق کی رائے اور سمجھ سے مخالف ہوتی ہے۔
یہ جذبہ مخالفت قریباً کل انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر مہذب اور تربیت یافتہ اور نیکدل آدمیوں میں اس کا ظہور اور طرح پر ہوتا ہے اور نامہذب اور ناتربیت یافتہ ذات آدمیوں میں اس کا ظہور دوسری طرح پر ہوتا ہے پہلا اس مخالفت سے ہر قسم کے فائدے اٹھاتا ہے اور دوسرا ان فائدوں سے بھی محروم رہتا ہے۔ اور دنیا میں خود اپنے تئیں بدطینت اور کذاب اور نامہذب ثابت کرتا ہے ✦

دُنیا میں یہ بات قریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر گو وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو متفق ہو جاویں۔ پس ضرور ہے۔ کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے۔ کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو حق لوں اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں اور جب ایسی کوئی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے۔ اور ان غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے۔ جیسے ایک دلسوز دوست بتاتا ہے۔ کہیں کہیں طبیعت کو تر و تازہ کرنے کے لئے نہایت دلچسپ ظرافت بھی کر بیٹھتا ہے۔ اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اٹھتا ہے اور باوجود مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے ؁

کمینہ طبیعت اور نامہذب ناشائستہ آدمی یہ رستہ نہیں چلتا وہ بات کے حسن و قبح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے مخالف کے عیوب ذاتی پر بحث کرنے لگتا ہے سخت کلامی درشتی گوئی سب و شتم اپنا پیشہ کر لیتا ہے اپنے مخالف کے عیوب واقعی ہی کے بیان پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ ہر قسم کے بہتان اس پر لگاتا ہے اور جھوٹی جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور خود مورد لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ بنتا ہے۔ اس راہ چلنے سے اور جھوٹ اتہام کرنے سے اور لعنت خدا کا مورد بننے سے اس کا مطلب اپنے مخالف کو بدنام کرنا اور عام لوگوں میں جو اس کے مخالف کے حال سے واقف نہیں ہیں۔ ناراضگی پیدا کرنا ہوتا ہے مگر درحقیقت اسکا یہ مطلب

حاصل نہیں ہوتا اور بعوض اس کے کہ اسکا مخالف بدنام ہو خود ہی زیادہ رسوا اور بدنام ہوتا ہے اسلیئے کہ جب اس مخالف کی برائی جو اس نے براہ کذب و اتہام اس کی نسبت منسوب کی مشہور ہوتی ہے تو کوئی اسکو سچ سمجھتا ہے اور بہت لوگ اس کی تحقیق کے درپے ہوتے ہیں اور جب اس کی کچھ اصل نہیں پاتے تو بعوض اس کے مخالف کے خود اسی کذاب پر لعنت اور تھوہ تھوہ کرتے ہیں اور بقول شخصے کہ دروغ کو فروغ نہیں ہوتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اسکی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ جھوٹا بدگو خود اسی گڑھے میں گرتا ہے جو اس نے اپنے مخالف کے لیئے کھودا تھا۔ پس انسان کو چاہیئے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راستبازی نیکی اور نیکدلی کو کام میں لاوے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرنا ہے ؂

ہم کو بڑا افسوس ہے کہ ہمارے مخالف اس پچھلے طریقہ پر ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ ہم کو اپنی مخالفت کا یا اپنے پر اتہام کرنے کا یا اپنی بدنامی کا کچھ اندیشہ نہیں ہے۔ بلکہ اسبات کا افسوس ہے کہ انجام کو ہمارے مخالف ہی رسوا و بدنام ہوتے ہیں اور دنیا انہی کو دروغ گو و کذاب قرار دیتی ہے۔ اگر ان کو ہمارے حال پر رحم نہیں ہے تو خود ان کو اپنے حال پر رحم کرنا چاہیئے ؂

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؂

۱۱ خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا

اچھا لگتا ہے جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو دبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے۔ تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے۔ اسی طرح خوشامد بھی انسان انسان کے دل کو ایسا پگلا دیتی ہے۔ کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔

اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں۔ اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے۔ اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے۔ وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے۔ جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں۔ اور ان کی ایسی قدر کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے۔ اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آجاتا ہے۔ تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہو جاتی ہے۔ اور وہ مکرو

قریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے۔ تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنیوالا شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جبکہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ جو ہم میں نہیں ہے۔ یا ہم ایسے بنا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں۔ تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامد کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں۔ مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں۔ جیسے کہ دوسروں کے کپڑے۔ جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات نہایت عمدہ ہے۔ کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں۔ اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں۔ اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جائیں۔ کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چست چالاک آدمی اپنے موقعہ پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک روئی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقعہ پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے۔ جب چپ چاپ سوئی ہوتی ہے۔ تو خوشامد اس کو جگاتی اور اُبھارتی ہے۔ اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات

بخوبی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے ۔ اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں۔ کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے۔ جن کی وہ تعریف کرتے ہیں۔ اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے۔ کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال خط کو بھی قایم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو ؛

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے۔ کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے۔ بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں۔ جس کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں ؛

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے۔ جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے۔ تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا۔ مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے۔ تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاضی اور دانائی کو بدنامی اور نیکنامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔ اور عالی ہمت طبیعت کو منا سب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے۔ جیسے کہ غفلت اور حقارت

سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجہ سے اُوپر ہیں۔ اُنہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ جیسے کہ تھرما میٹر ہیں وہی حصّہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔ جو صاف اور سب سے اُوپر ہوتا ہے ؛

۱۲۔ گذرا ہوا زمانہ

برس کی آخیر رات کو ایک بڑھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے رات کی ڈراؤنی اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے۔ اور دم گھبراتا ہے بڑھا نہایت غمگین ہے۔ مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی آخیر رات پر وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے۔ اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے۔ اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اسکی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جبکہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کیلئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا۔ اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا" ہائے وقت ہائے وقت۔ ہائے گذرے ہوئے زمانے

افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا؟"
پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ۔ سڈول ڈیل بھرا بھرا بدن۔ رسیلی آنکھیں موتی کی لڑی سے دانت۔ امنگ میں بھرا ہوا دل جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانہ میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے۔ اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے۔ اور یہ کہتا تھا کہ آہ ابھی بہت وقت ہے؟ اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا۔ اور افسوس کرتا تھا۔ کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کیلئے تیار رہتا۔ آہ وقت گذر گیا۔ اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہکر برباد کیا۔ کہ ابھی وقت بہت ہے؟"

یہ کہکر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی کھولی دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اڑتے ہیں۔ اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا" ہائے ہائے میری گذری ہوئی زندگی بھی ایسی ڈراؤنی ہے۔ جیسی یہ رات"۔ یہ کہکر پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے جنکی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت

گذر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے۔ اور اس میں یہ آواز آتی ہے۔ کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کیلئے یہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے خاموش ہیں۔ اور انکی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جا رہی ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں ؟

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں۔ جو اس نے نہایت بے پرواہی اور بے مروّتی اور کج خلقی سے اپنے ماں بھائی بہن دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروت رہنا دوست آشنا کیساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا۔ اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اسکے دل کو پاش پاش کرتا تھا اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا۔ اور یہ کہکر چلا اٹھتا تھا۔ کہ ہائے وقت نکل گیا۔ ہائے وقت نکل گیا۔ اب کیونکر اس کا بدل ہو ؟

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے۔ اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے۔ پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا ؟

اتنے میں اس کو ادھیڑ پنا یاد آیا۔ جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی۔ اور نہ وہ جوانی کا جوبن نہ وہ دل رہا تھا۔ اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا۔ جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کیطرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا۔ نمازیں پڑھنی۔ حج کرنا۔ زکوٰۃ دینی۔ بھوکوں

کو کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کرکے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی۔ اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی۔ اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا۔ کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں۔ اور پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں نہ پیر اور نہ فقیر کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے۔ کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی۔ اب کچھ بس نہیں چلتا۔ اور پھر یہ کہکر چلا اٹھا، ہائے وقت ہائے وقت۔ میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا۔

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے، آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہوگیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا۔ کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا۔ وہ قریب ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اس کے پاس آگئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھکر حیران ہوگیا۔ اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجہ سے اس سے پوچھا۔ کہ تم کون ہو۔ وہ بولی۔ کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا۔ کہ تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے۔ نہایت آسان!

بہت مشکل ہے۔ جو کوئی خدا کے فرض اس بدوی کی طرح جس نے کہا۔ کہ وَاللّٰہِ لَا اَزِیْدُ وَلَا اَنْقُصُ ؎ ادا کر کر انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے۔ جو اخیر تک رہیگا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کیلئے کی جاتی ہے۔ وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی۔ اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا ؛

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا۔ اور دیکھا۔ کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے۔ ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا ؛

اپنا حال سوچکر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا۔ ہائے وقت ہائے وقت۔ کیا پھر تجھے

میں بلا سکتا ہوں۔ ہائے میں دس ہزار دینار بھی دیتا۔ اگر پھر وقت آتا اور میں جوان ہو سکتا۔ یہ کہکر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہو گیا ؛

تھوڑی دیر نہ گذری تھی۔ کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس کھڑی ہوئی۔ اس کے گلے لگا کر اس کی بلائیں لیں۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا۔ کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے۔ کیوں تو بیقرار ہے۔ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔ اٹھ منہ ہاتھ دھو کپڑے پہن نوروز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا۔ اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے۔ خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کا جواب دیا۔ کہ بیٹا تو ایسا مت کر جیسا اس پشیمان بڈھے نے کہا۔ بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا ؛

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ او ہو میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤنگا۔ اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا۔ جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا۔ اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا۔ او خدا تو میری مدد کر۔ آمین ؛

پس اے میرے پیارے نوجوان ہموطنوں ! اور اے میری قوم کے بچو ! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے۔ کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم

کی بھلائی میں کوشش کرے آمین ؛

۱۳۔ بحث و تکرار

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں۔ تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز انکے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہیں۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے۔ اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں۔ اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں۔ اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں۔ اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں اس کا کان اس کے منہ میں اور انکا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا یا جو کمزور ہوا۔ دم دبا کر بھاگ نکلا ؛

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے۔ واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے۔ واہ تم کیا جانو وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رُخ بدل جاتا ہے۔

آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ۔ ناک۔ بھوں۔ ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا۔ تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا۔ اور ایک ادھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنیوالا نہ ہوا۔ تو لڑنے نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جسقدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے۔ اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں توں تکار تک نوبت آجاتی ہے کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے پر ہی خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن انسان کو لازم ہے۔ کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے۔ اور اس کے پرکھنے کیلئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب اور شائستگی۔ محبت اور دوستی کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔

پس اے میرے عزیز ہموطنو! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو۔

یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو۔ تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دُو بدُو بات چیت کرتے ہو۔ تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ۔ لہجہ۔ آواز۔ وضع۔ لفظ اس طرح رکھو۔ جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو۔ مگر بناوٹ کبھی نہ پائی جائے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یا شاید مجھے دھوکا ہوا یا غلط سمجھا۔ گو بات تو عجیب ہے۔ مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو۔ اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا۔ یا اس پر پھر خیال کرونگا۔ جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہکر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ۔ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے۔ اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا۔ کیونکہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے۔ اور ایسی عزیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔"

جبکہ تم مجلس میں ہو۔ جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں۔ تو جہاں تک ممکن ہو۔ جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو مت آنے دو۔ کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے۔ تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے۔ اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگتی ہے۔ تو جسقدر

جلد ممکن ہو اس کو ختم کر دو۔ اور آپمیں ہنسی خوشی۔ مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہموطن اس بات پر غور کریں۔ کہ انکی مجلسوں میں آپس کے مباحثۂ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے؛

۱۴۔ اُمید کی خوشی

اے آسمان پر بھُورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک اے آسمان کے تارے تمہاری خوشنما چمک۔ اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنیوالے دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالیشان درختو! اے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو۔ تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو اس لئے کہ ہم سے بہت دور ہو۔ اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے اِسی دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دُور ہے۔ وہی ہم کو زیادہ خوش کرنیوالی ہے؛

وہ چیز کیا ہے۔ کیا عقل ہے۔ جس کو سب سے اعلےٰ سمجھتے ہیں کیا وہ ہم کو آئندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ کرے۔ تو نیچر تک اس کی رسائی ہے جو سب کے سامنے ہے؛

او نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید۔ یہ

خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لئے نام آوری۔ نام آوری کیلئے بہادری۔ بہادری کے لئے۔ فیاضی فیاضی کے لئے۔ محبت۔ محبت کے لئے۔ نیکی۔ نیکی کے لئے انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرمانبردار ہیں۔

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے جنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی۔ تو ہی نے اس نا امید کو نا اُمید ہونے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس کو اس ذلت سے نکالا۔ اور پھر اسی کو اعلےٰ درجہ پر پہنچایا۔ جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تھا۔

اس نیک بنی کو جس نے سینکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی۔ تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا ناخدا جبکہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا۔ اور بجز مایوسی کے اُوپر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام

کی طرح پہنچی جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔
اے آسمانوں کی روشنی اور اے نا امید دلوں کی تسلی امید۔ تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے۔ تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی ہی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے درمیان جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈھتا ہے وہاں کی ٹھنڈی ہوا خوش الحان جانوروں کے راگ بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں۔ اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔
دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دہندے میں لگی ہوتی ہے۔ اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے۔ اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ۔ اے میرے دل کی کونپل سورہ۔ بڑھ اور پھل پھول تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پائے۔ تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے۔ کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آوے۔ کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت۔ تیری لیاقت

تیری محبت جو تو ہم سے کریگا۔ آخر کار ہمارے دل کو تسلی دینگے۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہوگی۔ تیری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کرینگی۔ تیری آواز ہمارے لئے خوش آیند راگنیاں ہونگی۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ اے ہماری اُمیدوں کے پودے سورہ۔ بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جُدا ہوجاوینگے۔ تو تم کیا کروگے تم ہماری بے جان لاش پاس کھڑے ہوگے۔ تم پوچھوگے۔ اور ہم کچھ نہ بولیں گے۔ تم روؤگے اور ہم کچھ رحم نہ کرینگے اب میرے پیارے رونے والے۔ تم ہمارے ڈھیر پر آکر ہماری روح کو خوش کروگے۔ آہ ہم نہ ہونگے اور تم ہماری یادگار رہی ہیں آنسو بہاؤگے اپنی ماں کا محبت بھرا چہرا اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کروگے۔ آہ ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کر تم رنجیدہ ہوگے سورہ میرے بچے سورہ سورہ میرے بالے سورہ ÷

یہ اُمید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جبکہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا۔ اور اماں اماں کہنا سیکھا۔ اس کی پیاری آواز دو ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا تھا۔ مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غمزدہ دل سے سنانے لگا۔ اور جبکہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھکر ہاتھ منہ دھوکر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا۔ اور اپنے بیگناہ دل بے گناہ زبان سے بے ریا

خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا۔ تو اُمید کی خوشیاں اور کسی قدر زیادہ ہوگئیں اس کے ماں باپ اس معصوم سینہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں۔ آہ! ہماری پیاری اُمید تو ہی ہے۔ جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھو وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہوگیا ہے۔ وہ اس کو ڈھونڈھتا ہے۔ پر وہ نہیں ملتا۔ مایوس ہے پر امید نہیں ٹوٹی۔ لہو بھرا دانتوں پیٹھا کرتے دیکھتا ہے۔ پر ملنے سے نا اُمید نہیں۔ فاقوں سے خشک ہے غم سے زار زار ہے۔ روتے روتے آنکھیں سفید ہوگئی ہیں۔ کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ مگر پھر ایک اُمید ہے۔ جس نے اس کو وصل کی اُمید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ہے۔

دیکھ وہ بیگناہ قیدی اندھیرے کنوئیں میں سات تہ خانوں میں بند ہے اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے بے یار و دیار غیر مذہب لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین کرتی ہے۔ قیدخانہ کی مصیبتا اس کی تنہائی۔ اس کا گھر اندھیرا اور اپنی بیگناہی کا خیال اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اُس کا ساتھی نہیں ہے۔ مگر اپنی ہمیشہ زندہ رہنے والی اُمید تجھی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے کرتا

تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں۔ مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے لڑائی کے میدان میں جبکہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے۔ دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے۔ اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے۔ اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بیخوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانیوالی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے۔ تو اسے بہادروں کی قوتِ بازو اور اے بہادری کی ماں تیرے ہی سبب سے فتمندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ ان کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمے کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈھتا ہے۔ اُنکی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈھتا ہے۔ مشکل کے وقت ایک تُسی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے انہیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتوؤں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند۔ عزیز و اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر

پھر تھک چپ ہو رہتے ہیں ۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں۔ مگر ہاں ہاں کر کر محنت اور دلسوزی سے دور رہ کر بہت سی ہمدردی کرتے ہیں۔ پر کوٹھی کھٹلے سے الگ کر کر۔ دل ہر وقت بیقرار ہے کسی کو اپنا سا نہیں پاتا۔ کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بیقرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطر دل کی تقویت۔ تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے تو ہی ہمارے دل کی تسلّی ہے تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچیں گے۔ تیرے ہی سبب گوہر مراد کو پاویں گے اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے مہدی کی پیاری "نا امید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید۔ جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے۔ لوح دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی رنگ فق ہو جاتا ہے منہ پر مردنی چھاتی ہے ہوا ہوا ہیں۔ پانی پانی ہیں مٹی مٹی ہیں مٹنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔

اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ملتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوتی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے

اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی۔ امید ہوتی ہے ؀

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لئے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس لازوال آنے والی خوشی کی امید تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے ؀

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر کبھی نہیں پہنچی۔ تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے۔ ایمان کے توشہ اور امید کے ہادی اور موت کی سواری سے مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے۔ جس کا پیارا نام "امید" ہے ؀

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے۔ کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے وہ اپنے اس بے تکلیف آنے والے زمانہ کی امید میں نہایت بردباری سے اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونیکی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے ؎

بقدر رہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

۱۵ سولزیشن یا تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے؟ یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے۔ جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے۔ کہ اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے۔ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی ہے۔ تو وحشیوں میں شہریوں میں سب میں اس کا نشان ملیگا۔ گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں الا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطرتی بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے۔ اور کسی کو ناپسند یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے۔ اور کسی چیز کو برا اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اس بری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے۔ جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے۔ جو انسانوں کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے اسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے

دو اصول ٹھہرے۔ اچھا اور برا اور برے کو اچھا کرنا۔ سولزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا اور برا قرار دینے کے مختلف اسباب ملکی اور ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور برا ٹھہرانے میں یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے۔ دوسری قوم اسی بات کو بہت برا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوم کے باہم ہوتا ہے اشخاص میں نہیں ہوتا۔ یا بہت ہی کم ہوتا ہے جبکہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان کی حاجتیں ان کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں ان کی معلومات اور ان کے خیالات ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لئے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے مگر جب کہ مختلف گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں تو انکی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے۔

ملکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ فکر اور خیال اور دماغ سے ان کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں۔ بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے۔ جس کے سبب سے وہ اچھا اور

برا ٹھہرتا ہے۔ اور جس سبب سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے۔ اور تبادلہ واقع ہوتا ہے۔ جو سولزیشن کہلاتا ہے پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں۔ جن کے سبب سے اچھے اور برے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

اچھے اور برے کی جگہ میں اور لفظ کا استعمال کروں گا یعنی پسند اور ناپسند انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہے ہماری زبان میں بھی اس قسم کے لفظ ہیں۔ جیسے کہ مزا یا مذاق۔ مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ ان سے وہ عام اور وسیع معنے خیال میں نہیں آتے اس واسطے میں اس لفظ کا ترجمہ پسند کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا جو خیال کے صحیح ہونے کے فرع ہے بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے:-

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات پر اور علم طبیعات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی وہ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مؤدب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو کہ بری حالت سے اچھی حالت میں لانا۔ دنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہو یا مادی یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں پر

پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دینا۔ تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر یاقوت والماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے چاندی۔ مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں سے چھلتے ہوئے سنہری پست اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالیشان بنتے ہیں۔ اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور ان کے رہنے کے گھونسلے درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈ کھودی ہوئیں کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں تمدن کے قاعدے۔ عیش و عشرت کی مجلسیں۔ خاطر اور مدارات کے کام اور اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں پائی جاتی ہیں۔ علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں۔ بلکہ بعضی چیزیں ان میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے۔ ناتربیت یافتہ قوموں میں حسب عمدگی و خوبی سے

پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے۔ اور وہاں دلی جوشوں
اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں
میں نہایت ترقی پائی ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت
دکھائی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت اس کا گھٹاؤ اور اس کا بڑھاؤ
اس کا ٹھہراؤ اور اس کی اونچ۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک
زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب
چیزیں دلی جوش کی موجب ہیں۔ وہ لے اور تال۔ راگ و راگنی کو جانتے
ہیں مگر دل کی لہر ان کی لے اور دل کی پھڑک ان کا تال ہے۔ ان کا غول
باندھ کر کھڑا ہونا طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا دل کی بیتابی سے جھکنا
اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا گو نزاکت اور فن غنا گری سے خالی ہو
مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دلی جذبوں کا روکنا اور ان کو عمدہ
حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح
کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں۔ اسی طرح اس
کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں کہ ترقی
یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ کی
طرف تحریک ہو سکتی ہے۔ اسی سے تہذیب بھی متعلق ہے پس سولزیشن
یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتد
پر رکھنا وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا اور ان
کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور اخلاق

تمدنی اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پہنچانا اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اور اس کا نتیجہ کیا ہے۔ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے:۔

اس تہذیب کے حاصل ہونے کے بقول مسٹر ایچ۔ ٹی۔ بکل صاحب کے چار اصول ہیں:۔

اوّل۔ جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں اور جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا۔ ان کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا اور ان کے علوم کو پھیلانا پس جسقدر کامیابی اس میں ہوگی اسی قدر انسانوں کی ترقی ہوگی۔

دوم۔ اس تحقیقات سے پہلے تجسّس کا خیال پیدا ہونا چاہیے۔ جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے۔ اور بعد کو تحقیقات سے اس کی اعانت ہوتی ہے۔

سوم۔ جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں۔ وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں اور اخلاقی کی باتوں کو کسی قدر کم۔ مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقلی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے۔

چہارم اس تحریک کا بڑا دشمن جو درحقیقت سولزیشن کا بھی سخت دشمن ہے یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات کی نگرانی ہر طرح

سلطنت اور مذہب سے نہ ہو۔ تب تک انسان کے گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلا دے کہ ان کو کیا کرنا چاہئیے۔ اور مذہب یہ سکھلا دوے۔ کہ کس بات پر یقین کرنا چاہئیے۔

پچھلی بات میں مسٹر بکل سے مجھ کو کسی قدر اختلاف ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہ بادشاہ وقت ہم کو بتادے کہ ہم کو کیا کیا کرنا چاہئیے۔ انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے۔ اور جس قدر کہ ہندوستان میں بلکہ تمام ایشیا میں اور ٹرکی اور ایجپٹ میں بھی ناشائستگی اور ناتہذیبی ہے۔ اس کا بڑا سبب یہی خیال ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے غارت اور برباد کیا ہے اور یہی خیال ہے جو ہندوستان کی رعایا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً گورنمنٹ سے ناراض رکھتا ہے۔ پس جبتک یہ خیال نہ آوے گا کہ ہم خود سمجھیں کہ ہم کو اپنے لئے کیا کرنا چاہئیے اسوقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کی نہ دولت ہوگی۔ نہ حشمت نہ عزت ہوگی نہ منزلت اور نہ تہذیب ہوگی اور نہ شائستگی مگر دوسرا حصہ جو مذہب سے متعلق ہے وہ کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط یعنی غلط مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے اور اگر سچے مذہب میں غلط خیالات اور بے جا تعصبات اور مسائل اجتہادیہ اور عقائد قیاسیہ اس طرح پر مل جاویں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی احکام مذہبی میں اور ان میں کچھ تفرقہ و تمیز نہ رہے۔ جیسے کہ مذہب اسلام کی موجودہ حالت ہے اور جو تقلید کی تاریکی میں آنکھوں سے بالکل چھپ گیا ہے تو بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا

مثل مذہب غلط کے مانع ترقی ہے۔ الّا سچا مذہب جیسا کہ ٹھیٹ مذہب اسلام ہے۔ وہ کبھی ہارج ترقی انسان نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب و شائستگی کے کام دونو متحد ہیں :۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی +

۱۶۔ اپنی مدد آپ

خدا ان کی مدد کرتا ہے۔ جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی آپ مدد کرنے کا جوش۔ اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے۔ تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔ جب کہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنے آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنے آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے۔ از خود جاتی رہتی ہے اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو۔ تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے غیرت اور بے عزت ہو جاتی ہے۔ آدمی جسقدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں۔ خواہ اپنی بھلائی اور

اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں (یہ امر بدیہی اور لابدی ہے)
کہ وہ اسیقدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہموطن
بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں۔ کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی
اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ
ترقی کر گئے تھے یہ سمجھتے تھے۔ کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی و
خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو
یا گورنمنٹ کا اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسو
کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کر ان کا درجہ سب سے اعلے
اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں۔ ایک
شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آئرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی
کیوں نہ ہو جائے۔ یا کلکتہ میں وائسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہند
کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جاوے اس سے قومی عزت اور قومی بھلائی اور قو
ترقی کیونکر ہو سکتی ہے۔ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دیدینے سے گو
کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو۔ قوم کی کیا بھلائی ہو
ہے بلکہ خود اس کے چال چلن پر اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہ
ہوتا تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے ہاں یہ بات بے شبہ
کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ مگر عمدہ گورنمن
سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قویٰ کی تکمیل اور اپنی شخص

کی ترقی کر سکتا ہے؛

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے۔ کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور معمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے۔ جبکہ قانون کا عملدرآمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ اٹھا سکتا ہے جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو سست آدمی کو محنتی فضول خرچ کو کفایت شعار، شرابخور کو تائب نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ باتیں شخصی محنت کفایت شعاری نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی۔ قومی عزت۔ قومی اصلاح۔ عمدہ عادتوں۔ عمدہ چال چلن۔ عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے۔ نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجہ حاصل کرنیسے؛ پرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ اَلنَّاسُ عَلٰے دِیْنِ مُلُوکِھِمْ اگر اس مقولہ میں "النّاس" سے چند خاص آدمی مراد لئے جائیں جو بادشاہ کے مقرب ہوتے ہیں۔ تو یہ مقولہ صحیح ہے اور اگر یہ معنی لئے جائیں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے۔ رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سا رنگ بدلتی جاتی ہے نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے جو رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اس کو زبردستی

سے پیچھے کھینچ لاتی ہے اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھینچ جاتی ہے تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا کہ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اس زمانہ کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ ساتھ آگے کھینچ لیا ہندوستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے۔ گورنمنٹ کتنا ہی کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھنچتی۔ بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لاتی ہے۔

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے۔ یقینی اسی کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔ جسطرح کہ پانی خود اپنی پنسال میں آجاتا ہے اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن اخلاق و عادات تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے۔ کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب در حقیقت ان مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی عزت۔ شخصی ایمانداری۔ شخصی ہمدردی

اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی شخصی بے ایمانی شخصی بے عزتی شخصی خودغرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی برائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے اگر ہم چاہیں۔ کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جاوینگی جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کی ترقی نہ کی جاوے ؛

اے میرے عزیز ہموطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا۔ بات چیت کا۔ وضع و لباس کا۔ سیر سپاٹے کا۔ شغل اشغال کا۔ تمہاری اولاد کے لئے ہے۔ اس سے ان کی شخصی چال چلن۔ اخلاق و عادات نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا و کلاّ ؛

جب کہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی صلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے۔ کس قدر افسوس بلکہ ناواقفی کی بات ہے۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جسکو ایک ناخداترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے، بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بداخلاقی و خودغرضی جہالت اور

شرارت کا مطیع اور اپنی خودغرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے
بے پرواہ ہے وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے
یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں۔ جب تک
کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ
خیال ہے کہ ہماری اصلاح ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر
ہے۔ اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح
و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا گو کیسی ہی تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام
میں کی جاویں وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں۔
جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو
تو کچھ بھی نہیں ۔

مستقل اور مضبوط آزادی۔ سچی عزت۔ اصلی ترقی۔ شخصی چال چلن
کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن۔ معاشرت و تمدن کا محافظ
اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے۔ جان اسٹیورٹ مل
جو اسی زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گذرا ہے۔ اس کا قول ہے۔ کہ
ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر اس
کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے اور جو چیز کہ شخصی اصلاح
و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے درحقیقت وہی شئے اس کے لئے ظالم و
خود مختار گورنمنٹ ہے پھر اس شئے کو جس نام سے چاہو۔ پکارو
اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں۔ کہ جہاں شخصی

اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے۔ یا دب گئی ہے۔ وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ حکومت کیوں نہ قائم کی جاوے۔ وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اس اپنے مقولہ کی تصدیق کو ہندوستان کی اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اے مسلمان بھائیو! کیا تمہاری یہی حالت نہیں ہے۔ تم نے اس عمدہ گورنمنٹ سے جو تم پر حکومت کر رہی ہے۔ کیا فائدہ اٹھایا ہے۔ تمہاری آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا ہے۔ ہیچ، ہیچ، ہیچ۔ اس کا سبب یہی ہے۔ کہ تم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں۔ کہ کوئی خضر ملے۔ گورنمنٹ فیاض ہو۔ اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کیجائے۔ اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے۔ کہ اگر اسکو ہادی اور رہنما بنایا جائے۔ تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے۔ اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں۔ جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ کیا لاالہ اللہ فی ملکوتہ ہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں۔ اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں۔ انسانوں میں کچھ قدر منزلت کے لائق گنے جاتے ہیں۔

بڑا اچھا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے۔ وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح

سمجھیں گے۔ اور کام میں لاویں گے۔ تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے
اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے
بالکل مخالف ہیں پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو ؛

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش۔ یہ بھی ایک فندیمی
غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے۔ جو ولیم ڈارگن نے ڈبلن کی نمائش گاہ
دستکاری میں کہا تھا۔ جو ایک بڑا خیر خواہ آئرلینڈ کا تھا ؛

اس نے کہا۔ کہ جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں اسی وقت
مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی
کے لئے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں۔ مگر میرے دل میں بہت مضبوط یقین
ہے۔ کہ ہماری محنت ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا
ہوں۔ کہ اگر ہم محنت کیے جاویں۔ اور اپنی قوموں کو ٹھیک طور پر استعمال
کریں۔ تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقعہ یا آئندہ کی توقع اپنی بہتری کیلئے
نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دل
دلولہ اور محنت سے کام کیے جائیں گے۔ تو پورا یقین ہے۔ کہ تھوڑے زمانہ
میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جاویگی ؛

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ
انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی
ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں۔ زمین کے جوتنے والوں۔
کانوں کے کھودنے والوں۔ نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں۔ مخفی باتوں کو

ڈھونڈ کر نکالنے والوں۔ آلات جرِّ ثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں۔ ہنرمندوں۔ شاعروں۔ حکیموں۔ فیلسوفوں اور ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے۔ اور اس کو ایک اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب اور شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں۔ لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی۔ ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائداد کا وارث کیا ہے۔ جو ہمارے پرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی۔ اور وہ جائداد ہم کو اس لئے نہیں دی گئی ہے۔ کہ ہم صرف مثل مارِ سرِ گنج اس کی حفاظت ہی کیا کریں۔ بلکہ ہم کو اسلئے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں۔ اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کیلئے چھوڑ جاویں۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے ان پرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گنوا دیا

انگریزوں کو جو دنیا کے اس دور میں اس قدر ترقی ہوئی ہے۔ اس کا سبب صرف یہی ہے۔ کہ ہمیشہ ان کی قوم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ رہا ہے۔ اور اس قوم کی شخصی محنت اس پر گواہ عادل ہے۔ یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی قوم کی طاقت کا سچا پیمانہ رہا ہے۔

انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے۔ جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے۔ اور جنکی تمام لوگ عزت بھی کرتے تھے

کم درجہ کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے بھی اس قوم کی بڑی ترقی ہوتی ہے۔ گو کسی لڑائی اور میدان کار زار کی فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جرنلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں۔ لیکن وہ فتوحات ان کو زیادہ انہی محنتی لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب ہوئی ہے۔ عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں بہت سے ایسے شخص ہیں جن کی زندگی کا حال کسی نے نہ دیکھا۔ لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی پر ان کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے جیسا کہ ان خوش نصیب مشہور نامور آدمیوں کا ہوا ہے۔ جن کی زندگی کے حالات مورخوں نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں ٭

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے۔ اس شخص کا اس زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں اس کے ملک اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے۔ اور آئندہ کی نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے ٭

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ شخص ہی کی چال چلن میں یہ قوت ہے۔ کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ۔ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے۔ اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔ اور جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں۔ تو مکتب و مدرسے و مدرستہ العلوم

کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنے زندگی کے برتاؤ کا نام جس کو انگریزی میں "لبف ایجوکیشن" کہتے ہیں، انسان قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرسۃ العلوم کا علم طاق میں یا صندوق میں یا الماری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں گھر کے رہنے سہنے میں شہر کی گلیوں میں پھرنے میں۔ صرافہ کی دوکان کرنے میں۔ ہل جوتنے میں۔ کپڑا بننے کے کارخانہ میں۔ کلوں سے کام کرنے کے کارخانہ میں اپنے ساتھ ہوتا ہے اور پھر بے سکھائے اور بے شاگرد کیئے۔ لوگوں میں صرف اس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔

یہ علم وہ علم ہے۔ جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی پچھلے علم سے عمل چال چلن تعلیم نفسی۔ نفس کشی۔ شخصی خوبی۔ قومی مضبوطی۔ قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے۔ کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا۔ اور نہ یہ تعلیم کسی درجہ کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ لارڈ بیکن کا نہائت عمدہ قول ہے۔ علم سے عمل نہیں آجاتا۔ علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے۔ اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اسکے علم کو باعمل یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔ علم کی نسبت عمل اور سوانحعمری کی نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے۔

کیا یہی وجہ ہے۔ جو مدرسۃ العلوم مسلمانوں کے بانیوں نے یہ تجویز کی ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے گھروں سے اور بد صحبتوں سے علیحدہ مدرسۃ العلوم میں عالموں اور اشرافوں اور تربیت یافتہ لوگوں کی صحبت میں رکھے جاویں؟

۱۷۔ سمجھ

یعنی تمیز جس سے بھلائی برائی میں امتیاز کیا جاتا ہے

میرا یہ خیال ہے۔ کہ اگر انسانوں کے دلوں کو چیر کر ان کا حال دیکھا جاوے تو دانا اور نادان دونوں کے دلوں میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق نکلیگا۔ دونوں کے دلوں میں ہمیشہ بہت سے لغو اور بیہودہ خیال آتے ہیں۔ بیشمار وسوسے دونوں کے دلوں میں اٹھتے ہیں۔ مگر ان دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے۔ کہ دانا آدمی ان میں سے انتخاب کرتا ہے۔ اور سمجھتا ہے۔ کہ کون سے خیالات ایسے ہیں۔ جن کو گفتگو میں لانا چاہیئے۔ اور کون سے ایسے ہیں۔ جن کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ نادان آدمی ایسا نہیں کرتا۔ اور جو خیال اس کے دل میں آتا ہے بے سوچے سمجھے منہ سے بکتا جاتا ہے۔ دانشمند آدمی بھی دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں نادان کی مانند ہوتا ہے۔ جو اس کے دل میں آتا ہے۔ بے تردد دوست سے کہتا ہے۔ گویا اس کے خیالات ہی ایک بلند آواز میں آتے ہیں۔ سٹلی صاحب کا یہ قول ہے۔ کہ انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہیئے۔ کہ اس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے۔ اور دوست سے اس

طرح برتاؤ کرنا چاہیئے۔ کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جاوے۔ تو اس کے ضرر سے بچنے کی جگہ رہے۔ اس قول کی پہلی بات جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کی ہے۔ وہ نہایت عمدہ ہے۔ مگر پچھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ کی ہے۔ وہ کچھ اچھی نہیں۔ اس میں سمجھ کی بات کچھ بھی نہیں ہے۔ بلکہ نری مکاری ہے ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے۔ اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات کہہ نہیں سکتا۔ یہ سچ ہے۔ بعض دفعہ دوست دشمن ہو جاتے ہیں۔ اور دوست کے بھید کو کھول دیتے ہیں۔ مگر دنیا انہی کو دغا باز اور برا کہتی ہے۔ اور دوست پر بھروسہ کرنے والے کو نا سمجھ نہیں کہتی۔ ہاں البتہ دوستوں کے منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیئے۔

سمجھ صرف باتوں ہی میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ ہر قسم کے کاموں سے بھی متعلق ہے۔ اور گویا ہماری زندگی میں ہمارے تمام کاموں کی رہنما اور ہمارے لیے ہمارے قادر مطلق خدا کی نائب ہے۔ انسان میں بہت سی بڑی بڑی عمدہ عمدہ صفتیں ہیں۔ مگر سمجھ سب سے مفید ہے۔ سمجھ ہی کے سبب سے اور تمام صفتوں کی قدر ہوتی ہے۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ تمام صفتیں اپنے اپنے موقع پر کام آتی ہیں۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ شخص جس میں وہ صفتیں ہیں۔ ان صفتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سمجھ بغیر علم اور عقل دونوں ناچیز ہیں۔ بھلائی برائی دکھائی دیتی ہے۔ باوجودیکہ انسان میں نہایت عمدہ عمدہ خصلتیں ہوتی ہیں۔ مگر سمجھ بغیر ان کے

برتاؤ میں غلطیاں کرتا ہے اور نقصان پر نقصان اٹھاتا ہے۔ سمجھ ہونے سے صرف انہی خوبیوں کا جو اس میں ہیں۔ مالک نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسروں میں جو خوبیاں ہیں۔ ان کا بھی مالک بن جاتا ہے۔ سمجھ دار آدمی جس سے گفتگو کرتا ہے۔ اس کی لیاقت کو بھی جان لیتا ہے۔ اور اسی کی لیاقت کے موافق گفتگو کرتا ہے۔ اگر ہم انسانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں اور جماعتوں کی مجلسوں کے حالات پر غور کریں۔ تو ہم کو صاف معلوم ہوگا کہ ہر ایک مجلس میں نہ کسی عقلمند کی گفتگو کو غلبہ ہوتا ہے۔ اور نہ کسی بہادر اور دلیر کی گفتگو کو بلکہ اسی شخص کی گفتگو سب پر غالب رہتی ہے۔ جس کو سمجھ ہے۔ اور جو اہلِ مجلس کی لیاقتوں اور جو بات کہنی ہے۔ اور جو نہ کہنی ہے۔ اس میں تمیز کر سکتا ہے جس شخص کو بڑی سے بڑی لیاقت حاصل ہو۔ پر سمجھ نہ ہو۔ وہ ایک نہائیت قوی اور زبردست پر اندھے کی مانند ہے۔ جو بسبب اندھے پن کے اپنے زور و قوت سے کچھ کام نہیں لے سکتا ہے۔ گو ایسے شخص کو دنیا میں اور سب طرح کے کمال حاصل ہوں مگر سمجھ نہ ہو تو وہ دنیا میں کسی کام کا نہیں بر خلاف اسکے اگر اس کی سمجھ پوری ہو اور صرف اسی ایک صفت میں اس کو کمال ہو۔ اور باقی اوصاف متوسط درجہ کے رکھتا ہو۔ تو وہ اپنی زندگی میں جو کچھ چاہے۔ کر سکتا ہے۔

سمجھ جس طرح کہ انسان کے لئے بہت بڑا کمال ہے۔ اسی طرح مگر اس کے حق میں بہت بڑا وبال ہے۔ نیکدل کی منتہائی خوبی سمجھ ہے۔ اور بددل کی منتہا بدی یا برائی کہو۔ کہ وہ نیکدل کے لئے معراج ہے۔ اور یہ بددل کے لئے کمال۔ سمجھ نہائت عمدہ اور نیک مقصد پیدا کرتی ہے۔ اور ان کے

حاصل ہونے کو نہایت عمدہ عمدہ اور تعریف کے قابل ذریعے قائم کرتی ہے۔ مگر مکر میں صرف خود غرضی ہوتی ہے سمجھ مثل ایک روشن آنکھ کی ہے۔ جس میں بے انتہا وسعت ہے۔ اور تمام دنیا کو اور دور دور کی چیزوں کو آسمانوں کو اور آسمانوں کے ستاروں کو بخوبی دیکھ سکتی ہے۔ مکر مثل ایک کوتاہ نظر آنکھ کے ہے۔ جو پاس پاس کی ناچیز چیزوں کو دیکھ سکتی ہے۔ اور دور کی چیزیں گو وہ کیسی ہی عمدہ اور روشن ہوں اسے نظر نہیں آتیں سمجھ جس قدر ظاہر ہوتی جاتی ہے۔ اسی قدر انسان کا اختیار اور اعتبار بڑھتا جاتا ہے۔ مکر کاٹھ کی ہنڈیا کی مانند ہے۔ کہ جب ایک دفعہ کھل گیا۔ تو پھر اس کی قوت اور عزت بالکل جاتی رہتی ہے۔ پھر انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ جو کام کہ وہ ایسی حالت میں کر سکتا ہے۔ جب کہ لوگ اس کو سیدھا سادہ بھولا بھالا آدمی سمجھتے۔ اب وہ کام بھی وہ نہیں کر سکتا سمجھ عقل کے لئے کمال ہے۔ اور ہمارے کاموں کے لئے رہنما۔ مکر ایک قوت ہے۔ جو صرف حال ہی کے فائدوں کو دیکھتی ہے سمجھ نہایت عقلمند اور نیک آدمیوں میں پائی جاتی ہے۔ مکر اکثر جانوروں میں اور ان لوگوں میں جو جانوروں کی مانند یا ان سے کچھ بہتر ہوتے ہیں۔ پایا جاتا ہے سمجھ نفس الامر میں ایک نہایت خوبصورت دلکش چیز ہے۔ اور مکر گویا اسکی بگاڑی ہوئی نقل ہے۔ سمجھ والے آدمی کی طبیعت ہمیشہ زمانہ حال اور مستقبل دونوں پر لگی رہتی ہے۔ جو باتیں کہ زمانہ دراز کے بعد ہونے والی ہیں۔ اور جو اب ہو رہی ہیں۔ دونوں کو دیکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رنج و خوشی جو دوسری یعنی قیامت میں ہونے والی ہے۔ بیشک وہ ہوگی۔ گو اس کا زمانہ ابھی بہت

دور ہے۔ وہ اس کے دور ہونے کے سبب سے اس لئے اس کو چیز نہیں سمجھتا۔
کہ دوسری زندگی یعنی قیامت کی تکلیف و راحت لمحہ لمحہ پاس آتی جاتی ہے۔
اور اسی طرح سے۔ رنج و خوشی ہو گی۔ جیسے کہ زمانہ حال میں رنج و خوشی
ہوتی ہے۔ اس لئے وہ نہایت غور و فکر سے ان خوشیوں کے ہاتھ آنے کے
لئے کوشش کرتا ہے۔ جو قدرت نے اس کے لئے بنائی ہیں۔ اور جن کے لئے وہ
پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے خیال کو ہر کام کے انجام تک دوڑاتا ہے۔ اور اس کے
حال و مآل کے نتیجوں پر غور کرتا ہے۔ اور اس فانی دنیا کے تھوڑے سے نفع اور فائدہ کو
گو در حقیقت وہ نفع اور فائدہ اس کی سچی عاقبت کے خیال کے مخالف ہو چھوڑ
دیتا ہے۔ غرضیکہ اس کی تمام تدبیریں عمدہ ہوتی ہیں۔ اس کا رویہ ایسے شخص
کی مانند ہوتا ہے۔ جو اپنا فائدہ بھی سمجھتا ہے۔ اور اس کے حاصل کرنے کا مناسب
طریقہ بھی جانتا ہے۔ سمجھ جس کو میں نے اس مضمون میں بطور ایک نیکی اور
کمال کے بیان کیا ہے۔ وہ صرف دنیا ہی کے کاموں کے لئے مفید نہیں۔ بلکہ
ہماری ہمیشہ رہنے والی زندگی کیلئے بھی فائدہ مند ہے۔ وہ صرف اس فانی
انسان کے لئے ہی رہنما نہیں ہے۔ بلکہ اس اصلی نا فانی انسان کیلئے بھی جو ہم
میں بولتا ہے۔ رہنما ہے۔ بعض مصنف اسی کو عقل کہتے ہیں۔ اور بعض سمجھ یعنی
تمیز جس سے اچھی و بری بھلائی اور برائی میں امتیاز کیا جاتا ہے حقیقت
میں یہی چیز سب سے بڑی ہے۔ اس کے فائدے بے انتہا ہیں اور پھر
اس کا ہاتھ آنا نہایت ہی آسان ہے۔
ایک مصنف کا قول ہے۔ کہ سمجھ ہی ایسی دونوں کی چیز ہے۔ جس کو کبھی

زوال نہیں ۔ جو اس کو چاہتے ہیں ۔ آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں ۔ جو اس کو ڈھونڈتے ہیں ۔ وہ آسانی سے پاتے ہیں ۔ اس کی تلاش میں ان کو بہت دور جانا نہیں پڑتا ۔ کیوں کہ وہ اس کو اپنے ہی دروازے پر پاتے ہیں ۔ اس کا خیال رکھنا ہی اس میں کمال حاصل کرنا ہے ۔ جو کوئی اس پر خیال رکھتا ہے ۔ اسی دم جستجو سے چھوٹ جاتا ہے ۔ کیوں کہ وہ خود ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہے ۔ جو اس کے لائق ہیں ۔ ان کو رستہ ہی میں ملتی ہے ۔ اور پھر کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی ۔

افسوس کہ ہماری قوم میں سب کچھ ہے ۔ پر یہی نہیں ۔

۱۸ ۔ اختتام سال ۱۲۹۱ھ و شروع سال ۱۲۹۲ھ

سوا چار برس بخیریت گذر گئے ۔ اب پھر نیا سال شروع ہوا ۔ گذشتہ برسوں میں جو کچھ ہنگامے ہونے تھے ہوئے ۔ اب دُم باقی رہ گئی ہے ۔ چاند کی بڑھیا کی کہانی ہے ۔ کہ ہاتھی نکل گیا ۔ پر دم باقی ہے ۔ آج اگر ہم اپنی قسمت پر فخر کریں ۔ تو بجا ہے ۔ اور اگر اپنی قوم کے اقبال کی فصل بہار کی آمد کی خوشیاں منائیں تو زیبا ہے ۔ جو کچھ اس سوا چار برس میں ہوا ۔ کیا ایسے قلیل زمانہ میں اسکے ہونیکی ہم کو توقع تھی ۔ توبہ توبہ ۔ کیا ہم کو ایسا جلد ان ناچیز پرچوں سے اپنی قوم کے جگانے اور اٹھانے کی جو مدت دراز سے غفلت کے تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی بےخبر سو رہی تھی ۔ توقع تھی ۔ استغفر اللہ

وہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال ۱۲۸۰ھ نبوی اور ۱۲۸۷ھ جب تک

ہمارا پہلا پرچہ نکلا - امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جائیگا
ہماری قوم کی جو کچھ بد اقبالی تھی - وہ یہی تھی - کہ کچھ نہ جانتے تھے - اور جانتے
تھے - کہ ہم سب کچھ ہیں - اس غفلت کی دارو نے بیہوشی نے ان کے کانوں
کو بہرا کر دیا تھا - ان کی آنکھوں کو پتھرا دیا تھا - دل پتھر ہو گئے تھے - دماغ قابو
میں نہیں رہا تھا - ہاتھ پاؤں سست ہو گئے تھے - زندہ تھے - پر مردوں سے
بدتر تھے - اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تھے - پر کچھ نہ کرتے تھے - اسی تھوڑے
عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی - کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہو گئے - وہ سمجھے
کہ ہماری کیا حالت ہے - اور ہم پر کیا مصیبت ہے - لبوں پر جان ہے -
پھر اگر جان نہیں تو جہان نہیں - کچھ لوگ ہوشیار ہوئے - پر ابھی آنکھیں
ملتے ہیں

بہت سونے اور اندھیرے میں پڑے رہنے سے چیپڑ جما ہوا ہے -
کچھ کھلتی ہیں - مگر روشنی سے چندھیا جاتی ہیں - کچھ لوگ ابھی تک نیند
کے خمار میں ہیں - کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے - مگر ابھی انگڑائی لے کر اور
کروٹ بدل کر پھر غافل ہو جاتے ہیں - چپ - پھر جھنجوڑو تو ہاں - اچھا
کہہ کر دوسری کروٹ لیتے ہیں - اور پھر غافل ہو جاتے ہیں - کچھ لوگ ایسے
ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں - اور کچھ ایسے ہیں - کہ ہوشیار ہوئے
ہیں - مگر بدمزاجی اور نشہ خودی سے ضد میں آکر کمل تانے پڑے ہیں - اور کہتے
ہیں کہ ہاں ہم نہیں اٹھنے کے - تمہارا کیا چارہ ہے - ہم یونہی پڑے رہیں گے
بعضے ان میں سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں - کہ تم بھی پڑے رہو مت اٹھو

سید احمد کون ہے جو جگاتا پھرتا ہے۔ ہم اسی بات کو سن کر خوش ہوتے ہیں بلکہ دور ہی سے کھڑے کہتے ہیں۔ کہ دو اٹھے۔ وہ کروٹیں لیتا۔ خدا نے چاہا تو اب سمجھدار بھی ہو جائیں گے۔ یہی رست وخیز ہماری قوم کی اقبال کی نشانی ہے بقر پسیجا تو سہی اب کسی نہ کسی طرف بہ نکلیگا۔ لوہا پگلا تو سہی۔ اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہیگا۔ بند پانی سے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پانی کو بہنا چاہیئے پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنا لیگا۔ اس وقت ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے۔ کہ ہماری حالت اچھی نہیں۔ قوم کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی چاہنے والے ہیں۔ جان نہیں ڈال دیتی ہے۔ سولزلیشن جس کے نام سے لوگوں کو نفرت تھی۔ کیا اب اس کا چرچا ہر گلی کوچہ میں نہیں ہے۔ کیا نیچر کا قافیہ تنگ نہیں ہوتے۔ اب لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے۔ معاف کیجئے ان صدی سونے والوں کا ذکر نہیں ہے کیا قومی ہمدردی کی کسی نہ کسی قدر تحریک اب ہر ایک کے دل میں نہیں ہے۔ کیا چار دانگ ہندوستان کے اخباروں میں تہذیب تہذیب۔ سولزلیشن سولزلیشن قومی ہمدردی قومی ہمدردی۔ پیٹریاٹزم پیٹریاٹزم کا غلغلہ نہیں ہے۔ کوئی اخبار اٹھا ڈالو۔ ان میں سے کسی نہ کسی پر کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا آرٹیکل دیکھ لو جس گلی کوچہ میں جاؤ۔ سید احمد کے تہذیب الاخلاق کا جھگڑا سن لو مکہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ۔ مدینہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ۔ برا کہو خواہ بھلا کہو۔ مگر ہم دعا گو ہیں کہ مت بھولو سہ

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یہ ولولہ اور غلغلہ اور ہر ایک بات کا چرچا در اصل ہماری قوم کی بھلائی کی نشانی ہے۔ اس پر ہم کو ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ کہ کسی کی کیا رائے ہے کسی کی کیا۔ کیوں کہ جو بات ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آج نہیں کل۔ کل نہیں پرسوں سب کو معلوم ہو جاویگی۔ اور سب اسی پر لعنت کریں گے اور اسی پر متفق ہوں گے۔ ضرور ایک دن وہ آویگا۔ جو قوم کہے گی۔ کہ ہاں سیّد بھی کوئی دیوانہ تھا۔ پر بات ٹھکانے کی کہتا تھا۔ اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہو۔ اور درحقیقت ہماری قوم میں ایسی تحریک آ گئی ہو۔ تو ہمارے اس ناچیز پرچہ نے اپنا کام پورا کر لیا۔ اور اسکی مراد پوری ہو گئی۔

مگر ہمارے بعض محبّ جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی ترقی چاہتے ہیں کبھی غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی ان کو کسی سولائزڈ (یعنی مہذب و تربیت یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے۔ تو اس کو بہت کرّوفر سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب اس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں۔ تو ہماری قوم کو کیوں برا کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو سمجھنا چاہیے۔ کہ اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھلی کو ٹٹولیں۔ تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا۔ ہم کو اپنی آنکھ کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہیے۔ دوسرے کی آنکھ میں پھلی ہو یا نہ ہو۔ با ایں ہمہ وہ لوگ اس بات میں ذرا انصافانہ بھی نظر نہیں کرتے۔ قوم کی محبت انصاف کو چھپا دیتی ہے۔ جیسے قوم کے کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت کرتے ہیں۔ اس وقت اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ کہ اس قوم میں خوبیاں

کتنی ہیں۔ ہماری قوم میں وہ عیب تو ہیں۔ اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں ہیں اعلیٰ محبت اور سچی خیرخواہی قوم کی یہی ہے۔ کہ اس کے نقصان کو دیکھے۔ اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں۔ ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر بہ نسبت ان کے جو قوم کی طرف داری کرتے ہیں۔ ان کے عیبوں کو چھپاتے ہیں۔ بہت زیادہ جلتا ہے۔ اور حقیقت میں وہی لوگ محب وطن و محبت قوم ہیں۔

۱۹۔ آخری پرچہ

تہذیب الاخلاق

سوتوں کو جھنجوڑتے ہیں تاکہ جاگ اٹھیں۔ اگر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تو مطلب پورا ہو گیا۔ اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے۔ اور کچھ جھنجلائے ادھر ہاتھ جھٹک دیا۔ ادھر پیر جھٹک دیا۔ اور جھنجلاہٹ میں اینڈے پڑے رہے۔ تو بھی توقع ہوئی۔ کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ چھیڑنا نہ چاہیئے۔ اور تہذیب الاخلاق کو بند کر کر دو سے نیند کے ان خمار آلودوں کا جواب صرف جھنجلاہٹ سے اینڈے پڑے ہیں۔ اٹھنا اور ہوشیار ہونا۔ دیکھنا چاہیئے۔ منہ سے اٹھاتے وقت کہہ

اٹھتے ہیں۔ کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے۔ تو ہم۔ اور پڑیں رہیں گے۔ تم تھک جاؤ ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہونگے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت منہ بسور کر ماں سے کہتا ہے۔ کہ بی یہ مت کہے جاؤ۔ کہ شاباش بیٹا پی لے۔ پی لے۔ تم چپ ہو رہو میں آپ ہی پی لونگا۔ لو بھائیو۔ اب ہم بھی نہیں کہتے۔ کہ اٹھو اٹھو پانی پی لو۔ پی لو۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ میں اپنے کو ناصح مشفق نہیں سمجھتا ہوں۔ بلکہ جو ہٹ اور جو حالت ہماری قوم کی ہے۔ اسکو جتلانا چاہتا ہوں

ایک دن تھے۔ کہ ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے۔ کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ اب ہماری یہ مثل ہے ؎

تو آج میر مسجد جامع کے ہیں امام
داغ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

کیا کیا خیالات ہماری قوم میں ہیں۔ جو ہم میں نہ تھے۔ اور کیسی کیسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں۔ جو ہم پر نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھکر تھے۔ جب زاہد خشک تھے۔ تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جب صوفی تھے۔ تو رومی سے بڑھ کر تھے۔ اب خاکسار ہیں۔ اور اپنی قوم کے غمخوار ہیں کو کس نے جگایا؟ دل اور زمانہ نے دل کی گھڑت ایسی تھی جس میں ہمیشہ غمخواری تھی۔ پر سوتا تھا۔ زمانے نے جھٹکا دیا۔ اور جگا دیا۔ دفعۃً دیکھا۔ کہ دنیا الٹ گئی۔ اور رنگ برنگ کی پھلواری سب اجڑ گئی۔ قوم کی حالت وہ دیکھی۔ کہ خدا کسی کو نہ دکھلائے۔ اسلام کی وہ صورت پائی کہ خدا

کرے کافر بھی نہ پائے اس بربادی کے سبب کا غیر قوم کو تو اور ہی خیال ہوا پر غلط ہوا۔ اور مجھ کو جو ہوا وہ خود اپنی قوم کی حالت کا ابتر ہونا تھا۔ قوم کیا دنیا کی باتوں میں اور کیا دین کے کاموں میں ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی۔ کہ اِدھر اُدھر کی چیزیں تو درکنار وہ اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ جس میں پڑی تھی۔ پھر میرا دل آخر دل ہی تھا۔ پتھر نہ تھا۔ جو نہ پگھلتا اور اپنی قوم کی حالت پر غم نہ کرتا۔ ایک مدت تک ایسی غم میں پڑا سوچتا رہا۔ کہ کیا کیجئے جو خیالی تدبیریں کرتا تھا۔ کوئی بن پڑتی نہ معلوم ہوتی تھی جتنی امیدیں کرتا تھا۔ سب ٹوٹ جاتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے۔ کرو جو کچھ کر سکو۔ ہو یا نہ ہو۔ اسی بات پر دل ٹھہرا۔ ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔ اس میں خدا کی طرف کا بدلہ تو نہ جب معلوم تھا۔ اور نہ اب معلوم ہے۔ مگر قوم کی طرف کا بدلہ اسی وقت سے معلوم تھا۔ جو اب ظاہر ہے۔ کافر۔ مرتد۔ ملحد۔ زندیق اسلام کا دشمن مسلمانوں کا ہاجی۔ قوم کا عیب جو دین دنیا سے آزاد۔ کہنا اور نام پر دو چار صلواتیں سنا دینا۔ اور ہم پر اس مثل کا صادق آنا۔ کہ "دھوبی کا کتا۔ گھر کا نہ گھاٹ کا"۔ مگر شکر ہے۔ کہ ان کی کسی بات نے ہمارا دل نہیں دکھایا۔ اور ہمیشہ ہمارے دل میں بھی رہا کہ اے نادان پر رحم کر کیونکہ وہ نہیں جانتے ؛

انہی قومی بھلائی کے ولولوں میں سے تہذیب الاخلاق کا نکالنا بھی ایک ولولہ تھا۔ جس کا اصلی مقصود قوم کو اس کی دینی اور دنیاوی ابتر

حالت کا جتلانا تھا اور سوتوں کو جگانا۔ بلکہ مردوں کو اٹھانا اور بند سڑے ہوئے
پانی میں تحریک پیدا کرنا تھا۔ یقین تھا۔ کہ سڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے
بدبو زیادہ پھیلے گی۔ مگر حرکت آجانے سے پھر خوشگوار ہو جانے کی توقع
ہوتی تھی۔ پس کیا ہم نے جو کچھ کرنا تھا۔ اور پایا ہم نے جو کچھ کہ پانا تھا۔ مگر
خدا سے آرزو ہے۔ کہ اگر ہم نے وہ نہیں کیا۔ جو ہم کو کرنا تھا۔ تو وہی کرے
جو اس کو کرنا ہے ؎

از بندہ خضوع و التجا مے زیبد
بخشائش بندہ از خدا مے زیبد
گر من کنم آنکہ مرا نا زیباست
تو کن ہمہ آنکہ ترا مے زیبد

سات برس تک ہم نے بذریعہ اس پرچہ کے اپنی قوم کی خدمت
کی مذہبی بے جا جوش سے جس تاریک گڑھے میں چلی جاتی تھی۔ اُس
سے خبردار کیا۔ دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے
میں وہ مبتلا تھی۔ اس میں ان کو روشنی دکھلائی۔ مذہب اسلام پر۔
نادانی کی جس قدر گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ ان کو مٹایا۔ اور اس کے اصلی
نور کو جہاں تک ہم سے ہو سکا۔ چمکایا۔ اردو زبان کا علم ادب جو بدخیالات
اور سڑے بھدے الفاظ کا مجموعہ ہو رہا ہے۔ اس میں بھی جہاں تک
ہم سے ہو سکا۔ ہم نے اصلاح چاہی۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ ہم نے
اس میں کچھ کیا۔ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں ان

باتوں میں بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی قومی عزت سلف آمیز یعنی اپنے آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا۔ تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے علم ادب میں داخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سننا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا۔ اردو زبان کے علم ادب کا ترقی پانا۔ یہی ہماری مرادیں تھیں۔ جن کو ہم نے پھر پایا۔ اب بہت لوگ جو ان باتوں کو پکارتے ہیں۔ گو اس وقت کھڑی ٹھیڑی لہریں کھاتے ہیں۔ مگر پانی میں حرکت کا آجانا کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنی ہی سال میں آپ چورس رہے گا۔ اس لیے مناسب ہے کہ اب ہم بس کریں۔ اور پانی کو آپ ہی آپ چورس ہونے دیں۔

ہمارے دوست ہماری اس خاموشی کا کوئی سبب دور از کار خیال نہ کریں گے۔ اور نہ اس پر التفات کریں گے۔ جو ہمارے ناصح نور الآفاق نے اپنے اخیر پرچہ میں لکھا تھا۔ بلکہ یہ خیال کریں گے۔ کہ ہم کسی دوسری قومی بھلائی کے کام میں مصروف ہوں گے۔ جو اس سے بھی زیادہ قوم کو مفید ہوگا۔ خدائے تعالے نے فرمایا ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بہت سے ایسے دوست ہیں۔ جو اس پرچہ کے بند ہونے سے نہایت ہی شکستہ خاطر ہونگے۔ مگر ہم ان سے معذرت کرتے ہیں۔ اور اب اس پرچہ کو ان سے رخصت کرتے ہیں اور وہ دن بھی اب آنے والا

ہے کہ ہم خود ہی ان سے رخصت ہو نگے ؛

ہم نے اپنے اس ارادہ سے اپنے بعض دوستوں کو مطلع کیا تھا۔ اور جب ان کو معلوم ہو گیا کہ ہم نے یہ ارادہ مصمم کر لیا ہے۔ تو انہوں نے ہمارے ان سات برس کے پرچوں کے ریویو لکھے ہیں۔ جن کو ہم نہایت احسان مندی و شکر گذاری سے اس اپنے اخیر پرچہ میں درج کرتے ہیں۔ والسلام ؛

فرہنگ

کندۂ ناتراش۔ پتھر جو تراش کر درست کیا جاتا ہے ؛

مذاق۔ شوق ؛

تکمیل۔ پورا کرنا۔ کمال کو پہنچانا ؛

ادیب۔ عالم ادب ؛

ریاضیات۔ جمع ریاضی ؛

علیٰ ہذا القیاس۔ اسی طرح ؛

حصول معاش۔ روزی کمانیکا ذریعہ

عملداری۔ حکومت ؛

جم غفیر۔ بڑی جماعت ؛

باوصف۔ ساتھ باوجود

اخلاق۔ جمع خلق بمعنی سجھاؤ ؛

حسن معاشرت۔ نیک گذائی ؛

محض ناواجب۔ بالکل ناموزون ؛

باتباع احکام - حکموں کے ماتحت یا
احکام کے مطابق -

آنکہ - فارسی لفظ بمعنی یہ کہ یا وہ کہ

نیک محضر - نیک ضمیر یا خصلت

اخلاقی خصائل - جمع خصلت یعنی
خلق کے متعلق خصلتیں -

نظام - بندوبست -

مرکب - مجموعہ

اولعزمیاں - بلند ارادے

منجملہ - من سے جملہ تمام بمعنی ان
تمام سے

مہذب - تہذیب یافتہ

دلی سعی - پوری کوشش

قرن - صدی

مبنی - بنیاد رکھی گئی ہے - یا انحصار ہے

متنبہ کرنا - تنبیہ کرنا - یا آگاہی

اختلاف - فرق

اتہام - بہتان

سماعت - سننا یا شنوائی

شریف النفسی - نیک دل ہونا یا روح
کی نیکی

منحصر - مبنی

حصول معاش - روزی کمانا

ٹیکنیکل ایجوکیشن - دستکاری - صنعت
و حرفت

وسعت - فراخی یا توسیع ہونا

تفوق - فرق یا امتیاز

متعدد - بہت سے یا کئی

معاش - روزی یا روزگار - روٹی

امور - جمع امر کی بمعنی کام -

دفعتہً - یکبارگی -

تعصب - اپنے مذہب کے سوا دوسرے
کے مذہب کو برا سمجھنا -

متعصب - تعصب کرنیوالا (اسم فاعل)

مخالفوں - دشمنوں

دیدہ دانستہ - جان بوجھ کر یا دیکھ کر
اور سمجھ کر

تمدن - بودوباش - رہنا سہنا

مدنی الطبع ۔ باہم مل جل کر رہنے کی خصلت
حوائج ۔ ضروریات ۔
منحرف ۔ اسم فاعل ۔ انحراف کرنیوالا روگرداں ۔
مقتضا ۔ تقاضا ۔ منشا
بالطبع ۔ فطرتاً
فضل و دانش ۔ بزرگی اور عقل
شائستگی ۔ لیاقت
جاہ و حشمت ۔ مرتبہ اور عزت
اخذ ۔ چن لینا ۔ اختیار کرنا ۔
بدگمانی ۔ شک
غلط نمائی ۔ غلطی پر ہونا ۔
نمودن ۔ دیکھنا ۔
توصیف ۔ صفت کرنا ۔ بڑائی بیان کرنا ۔
عقاید مذہبی ۔ جمع عقیدہ کی مذہبی ایمان ۔
برہمی ۔ بربادی ۔ تباہی ۔
براہین ۔ جمع برہان ۔ یعنی دلیلیں ۔

معترض ۔ اعتراض کرنے والا ۔
نادان دوست ہونا ۔ وہی مثال بیوقوف دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے ۔
حسن اخلاق ۔ نیک خلق ۔
راغب ۔ رغبت کرنیوالا ۔
جارح ۔ جرح کرنیوالا
ضمناً ۔ لگے ہاتھ ۔ ضمن میں
ہم جنس ۔ ہمسر ہم عادت
کنارہ گزیں ۔ علیحدہ ہونا ۔
کذب ۔ جھوٹ
تمول ۔ مالدار ہونا ۔ صاحب حیثیت
ریوڑ ۔ گلہ ۔
بیا ۔ ایک پرندہ ہے
تربیت ۔ تعلیم پانا
سم قاتل ۔ مہلک زہر
ہر کمالے را زوالے ۔ ہر کمال کو گھاٹا ہوتا ہے ۔
وضاحت ۔ واضح کرنا ۔

باز رہنا۔ محروم رہنا۔
کامل مطلق۔ پورا پورا کمال کو پہنچا ہوا
بجز۔ سوائے۔
ذات باری۔ خدا تعالے
سہو۔ غلطی
انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ جمع نبی
کی بمعنی نبیوں پر درود اور سلام ہو۔
ٹھیٹ غلطی۔ بالکل یا سراسر غلطی
" " " " "
استغناء۔ لاپرواہی۔
جودت طبع۔ طبیعت کی تیزی۔ طاقت
انتقال ذہنی۔
ٹھکاری۔ جانوروں کو ہانکنے کی آواز
مصداق۔ وہ شئے جس پر کوئی معنی
بولے جاویں۔ مثلاً انسان کے معنی ہیں
زید اور عمرو پر بولے جاتے ہیں۔
چارپائی پر دو کتابے چند۔ ایک چار پایہ
چند کتابوں سے لدا ہوا۔
رسوم۔ جمع رسم بمعنی رواج

معاشرت و مجالست۔ آپس میں اٹھنا
بیٹھنا بیٹھنا اور رہنا سہنا
پیشوا۔ گرو۔ رہبر
الٰہیات۔ علم الٰہی کے مسائل اور
بحث
پابند۔ قائم
علوم و فنون۔ جمع علم کی اور فن کی
بمنزلہ۔ مانند یا قائم مقام
بالعکس۔ الٹ
خندہ زن۔ ہنستے ہوئے
کنایات۔ جمع کنایہ کی مراد اشارہ
" " " " "
شامت اعمال۔ کاموں کی برائی
آرٹیکل مضمون
تناقص۔ اختلاف
متناسب۔ بہترین عمدہ
مطعون۔ طعنہ دیا ہوا یعنی حقیر قابل ملامت
جزو۔ حصہ
تقلید۔ پیروی

مستفید۔ فائدہ اٹھانیوالا
امتیاز۔ فرق معلوم کرنا
قوت استقراء۔ جزئیات معلوم کرنیکی قوت
ترمیم۔ کمی بیشی کرنا۔ اصلاح کرنا
پژمردہ۔ مردہ۔ نحیف
ارتکاب نہ ہو۔ مرتکب ہونا کسی گناہ
کے کرنے کا ذمہ دار ہونا
مقدور۔ طاقت یا قدرت
متحمل اور مطیع۔ بردبار اور اطاعت
کرنیوالی
گریز۔ پرہیز
بالکلیہ۔ کلی طور پر
محدود۔ حد میں گھیرا ہوا۔ کم
الا۔ مگر
باطل۔ ضائع
معدوم۔ نابود
زائل۔ تباہ ہونا
مزاحم۔ روکنے والا۔ مانع
قوت طبعی۔ نیچرل قوت

تصفیہ۔ صفائی کرنا۔ فیصلہ کرنا
مادہ ایجاد۔ ایجاد کرنے کی طاقت
یا عقل
آباؤ اجداد۔ باپ دادا
مسدود۔ بند ہونا۔ رک جانا
بالتخصیص۔ خاصکر۔ بالخصوص
نامی۔ مشہور
مشابہ۔ لگ بھگ
یکساں۔ برابر
مساوات۔ برابری
مستعد۔ طیار
عبرت۔ سبق
رائج۔ رواج میں ہے۔ یا ان کا
رواج ہے
اسرار۔ جمع سر بمعنی بھید
سکون پذیر۔ ساکن۔ مطمئن
اختلاط۔ آپس میں ملنا جلنا
بجز۔ سوائے
قوائے عقلی۔ عقلی طاقتیں

چارہ۔ علاج
شگفتہ۔ کھلا ہوا
معیوب۔ عیب دار۔ برا
توقع۔ امید
مباحات۔ جمع مباح جو بات شرح
نے جائز کر دی ہو
محرمات شرعیہ۔ جو شرح نے ممنوع
کر دی ہو۔
احتراز۔ پرہیز
خدا ہمہ سلماناں را کار توفیق دہاد۔ خدا
تمام مسلمانوں کو اس کام کی توفیق
دے۔
تربیت یافتہ۔ تعلیم یافتہ
آفرینش۔ پیدائش
تمثیلاً۔ مثال کے طور پر۔
حامی۔ حمایت کرنیوالا
لایعقل۔ بے عقل
لاشے۔ ناچیز
متصور۔ خیال کرنا۔

معاہدہ۔ قول و قرار
دستاویز۔ تحریر
ورثاء۔ ورثہ میں
تاحین حیات۔ زندگی میں رحین۔ وقت)
محاصل۔ آمدنی
بیع۔ بیچنا
مسودہ۔ عبارت جو سادہ طور پر
لکھتے ہیں
جرم قابل ضبطی جائداد۔ ایسا جرم جس
کی سزا جائداد کی ضبطی ہو
تائید۔ اتفاق رائے
سوتوں۔ جمع سوت بمعنی چشمہ۔
سرچشمہ
قوے۔ طاقت
طمطراق۔ دھوم دھام۔ کروفر
جبتہ۔ چوغا
بے مثل و نظیر۔ بیمثال و بدل
افراط۔ کافی
ناکارہ۔ نکما

طبیعت ثانی ہونا۔ جڑ پکڑنا۔ (ثانی معنی دیگر)

عارضی۔ غیر مستقل

مائل ہونا۔ رجوع ہونا۔

قمار بازی۔ جوا بازی

چھوہڑ۔ اکھڑ

پیچوان۔ حقہ

وحشت پنہ۔ حیوانگی۔

مستعدی۔ طیاری

اعتقادات۔ جمع اعتقاد (یعنی اعتبار

وحی۔ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام۔

اخلاق۔ جمع خلق

عقائد۔ عقیدہ۔ یعنی ایمان

متوجہ۔ توجہ کرنی۔ خیال کرنا

منقسم۔ تقسیم کیا ہوا۔

بدستور۔ ویسے کا ویسا

آسودگی۔ تسلی۔ قرار

متفق۔ اتفاق کرنا

نپٹ۔ بالکل۔

اغراض۔ جمع غرض۔ ضرورت

مباحثوں۔ جمع بحث یعنی رائے زنی کرنا

استحکام۔ مضبوط

متفرع۔ پیدا کرنا۔

امنگ۔ چاؤ۔ خیال

عداوت۔ دشمنی۔

صریح۔ صاف صاف

رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ انگلینڈ میں مذہبی دو فرقے ہیں

کرسچانٹی۔ عیسائی مذہب

جہاد۔ مسلمانوں کی مذہبی لڑائی

جبریہ۔ جبراً۔ ظلماً

مشکوک۔ شک ڈالا

مشرب۔ گھاٹ یعنی پانی پینے کی جگہ۔

تماش بینی۔ لچ پنا۔ عیاشی

اوجھل۔ آڑ

مناجات۔ کان میں بات کہنا

نمونہ - معیار
ہادی - ہدایت کرنیوالا
مطلوبہ - جائز
شفیق - دوست
ناصح - نصیحت کرنے والا
بخوبیدہ - ڈھونڈتا نہیں ہے
سوت - نہر
تقلید - پیروی
اختلاف - مختلف ہونا
فی نفسہٖ - حقیقت میں - اصل میں
جذبہ - خواہش
حاضر ناظر - موجود اور دیکھنے والا
ریاکاری - ظاہریت
رذیل - کمینہ
اتلاف - حقوق کے ضائع یا تلف کرنا
محسور - اسم مفعول
اوصاف حمیدہ - نیک صفتیں
بدطینت - بدباطن

کذاب - مبالغہ کا صیغہ ہے - بہت جھوٹ بولنے والا
درپے - پیچھے پڑنا - پوری پوری کوشش کرنا
دلسوز - دل کا جلا ہُوا مصیبت کا مارا
حسن و قبح - اچھائی و برائی
دروغ گوئی - جھوٹ بولنا
سب و ستم - گالی گلوچ دینا
عیوب - جمع عیب کی
مورد - اسم مفعول - جس پر وارد ہو
اتہام - بہتان لگانا -
فروغ - ترقی - اقبال
قلعی کھل جانا - راز فاش ہونا
مہلک - ہلاک کرنیوالا
وبائی ہوا - وبا سے ملی ہوئی ہوا
خوش گلو - اچھا گانے والا
پھسلانا - فریب دینا
بدزیب - ناموزوں

مفید - فائدہ مند
چھچھورے پن - رذالت
خط وخال - نقش ونگار
ناموری - مشہوری
پست ہمتی - کم ہمتی
مکتب - سکول
ہم مکتب - ہم سکول
سڈول - خوبصورت
ہولناک - بھیانک - ڈراؤنی
دانتوں میں انگلی دینا - حیران ہونا
کج خلقی - بد خلقی
بداطواری - بے مروتی - بے لحاظ
زکوٰۃ - مال کی کچھ فی صدی راہ خدا
پر دینا - یک صد میں ۲½ روپیہ
مقرر ہے
بیعت کرنا - پیر یا مرشد تسلیم کرنا - گورو
کے حکم ماننے کی قسم کھانا -
پٹ - دروازہ
ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا - برابر دیکھے جانا

گھورتے جانا
تسخیر - فتح
بدوی - دیہاتی عرب
مسخر - اسم مفعول - تسخیر کیا ہوا
مفتوح
ساعی - اسم فاعل - کوشش کرنیوالا
دلفریب - دل کو موہ لینے والا
بلائیں لینا - قربان ہونا - نثار ہونا
ہچکی بندھ جانا - گگی بندھ جانا
گونجیلی - گونجنے والی - عنیف آواز
ٹینٹوا - گلا
لپاڈگی - گھوسم گھونسا
بیچ بچاؤ - چھڑانے والا
غرفش - بحث وتکرار
کسوٹی - سونے پرکھنے کی پتھری
تردید - رد کرنا - باطل کرنا
معذرت - معافی نامہ
دوبدو - روبرو یا آمنے سامنے
کدورت - نفرت

دھنک -

بھانا - پسند آنا -

اکلوتی - اکیلی -

آڑے وقت - مشکل وقت

خوابیدہ - سوئے ہوئے

چنگل - پنجہ

ناخدا - کشتی بان

خوش الحان - خوش گلو یا آواز

گہوارہ - پنگھوڑا

کٹھن - مشکل

خوش آیند - خوش آواز

ڈھیر - ڈھیر

غوں غاں - بچے کے بولنے کی آواز

سروکار - مطلب - واسطہ

غمزدہ - مغموم - افسوسناک

تاروں کی چھاؤں میں اٹھنا -
علی الصباح اٹھنا

مہد سے لحد - ہمیشہ - تمام زندگی میں

آنکھوں کا سفید ہونا - اندھا ہونا

بے یار و دیار - کس مپرسی جس کا نہ کوئی مددگار اور نہ کوئی جگہ ٹھہرنے کی

آتشیں پہاڑ - آتش فشاں

یگانوں - دوست - رشتہ دار

آشنا - دوست

شکستہ خاطر دل - مجروح دل - ٹوٹے ہوئے دل

منزلِ مقصود - منزل جس کا قصد یا ارادہ ہے

چراغ ٹمٹمانا - خاتمہ ہونا

آفتاب لب بام ہونا - خاتمہ ہونا

لازوال - ہمیشہ رہنے والی

توشہ - ساز و سامان - زادِ راہ

بشاشت - خوشی

اصطلاح - ایک قوم کا کسی خاص مطلب پر اتفاق کرنا

فیلسوف - فلسفہ دان - دانا

تمدنی - تمدن کے بارے میں - بود و باش کا طریقہ

تصفیہ - صفائی کرنا - فیصلہ کرنا -

دافع - دور کرنے والا -

فرع - شاخ

علم طبعیات - وہ علم جس سے مادی چیزوں سے ادل بدل کی بہ ہیئت مجموعی بحث کی جاتی ہے -

پوتھوں - کچے موتی

مدارات - جمع مدارا کی بمعنی رعایت

موسیقی - ایک راگ کی قسم ہے

خنیاگری راگ گانا -

امکان - ممکن ہونا -

خوش اسلوبی - اچھا طریقہ

تمکین - عزت

وقار - عزت

تجسس - ڈھونڈھ - تلاش

اعانت - مدد

امورات - جمع امور - کام

ایجپٹ - مصر کا انگریزی نام ہے

ٹھیٹ - اصلی -

حارج - حرج کرنے والا

مقولہ - قول - پچھلے بزرگوں کی آزمودہ بات -

غیرت - شرم

از خود - خود بخود

لابدی - ضروری اور لابدی

حظ - لطف

تائب - توبہ کرنے والا

پنسال - پانی پلانے کی جگہ

ہمدردی - دکھ درد میں شریک ہونا

اشغال - جمع شغل

حاشا - ہرگز

کلا - ایک ایسا لفظ ہے - جو پچھلے کلام کی تردید کے لیے آتا ہے - یعنی ایسا ہرگز نہیں - یا دوسرے کلام کی تائید کے لیے جیسے ضروری ایسا ہی ہوگا

نادانی - بے وقوفی

ناخدا ترس - ظالم

فانوس خیال - ایک قسم کا کاغذی

فانوس جن میں ہاتھی، گھوڑے وغیرہ
ہوا کے ساتھ چکر کھاتے ہیں۔ فانوس
کے لفظی معنے شمعدان

قوانین ۔ جمع قانون بمعنی قاعدہ

آلات جرثقیل ۔ وزنی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا سامان

مار سر گنج ۔ یہ پرانا خیال ہے کہ جس
جگہ خزانہ دبا ہوا ہوتا ہے وہاں سانپ
اس کی حفاظت کرتا ہے ۔

کارزار ۔ لڑائی

فرائض ۔ جمع فرض

مشاہدہ ۔ دیکھنا

بانیوں ۔ جمع بانی کی بنیاد رکھنے والا

لغو ۔ بیہودہ

بے تردد بے کھٹکے ۔

منتہائی خوبی ۔ انتہائی خوبی

کاٹھ کی ہنڈیا کی مانند ۔ ناپائدار
بے بنیاد

نفس الامر ۔ فی الواقع ۔ درحقیقت

حال و قال ۔ حال اور قول

رویہ ۔ طریق

استغفر اللہ ۔ خدا معافی دے

چپیڑ ۔ میل

تندخوئی ۔ سخت عادت

کلبلانا ۔ کروٹیں بدلنا ۔

رستخیز ۔ ہل چل

چار دانگ ۔ چار سو (دانگ ۔ سمت)

پیٹریاٹزم ۔ حب وطنی

چرچا ۔ مشہوری

طمطراق ۔ کروفر

ٹینٹ ۔ آنکھ کی بیماری

گرفت ۔ پکڑ

ایڈے پڑنا ۔

خمار آلود ۔ نشے میں ہونا

ناصح مشفق ۔ دوست نصیحت کرنے
والا

جانماز ۔ مصلیٰ

زندیق ۔ ژند یا زردشت کا ماننے
والا ۔

کافر - ملحد
مرتد - کافر - خارج از اسلام
ہاجی - ہجوگو
چار صلواتیں سنا دینا - گالیاں دینا -
مقصود - مطلب -

خضوع - عاجزی
دانست - عقل
چوسر -
التفات - مہربانی
شکستہ خاطر - پریشان - مایوس
ریویو - کسی کی تحریر پر اپنی رائے زنی کرنا
